امام الہند

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابو علی اثری

عبدالمجید کھوکھر یادگار لائبریری گوجرانوالہ

امام الہند

مولانا ابوالکلام آزادؒ

مصنف

مولانا ابوعلی اثری

مرتب

ضیاءاللہ کھوکھر

عبدالمجید کھوکھر یادگار لائبریری

گوجرانوالہ

انتساب

میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے مختلف
پہلوؤں پر اپنے تاثراتی، تنقیدی اور متفرق مضامین کے اس مجموعہ کو

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

(معاون مدیر سہ ماہی اُردو، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی)

کے نام معنون کرتا ہوں، جو مولانا ابوالکلام کے شیدائی، اُن کے
ادب وانشاء کے پرستار، ان کے علوم ومعارف کے قدردان اور
ابوالکلام کی حیات پر پورے برصغیر یعنی ہندوستان و پاکستان و بنگلہ
دیش میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں، جن سے غائبانہ تعارف تو مولانا
ابوالکلام پر ان کے گراں قدر اور پُراز معلومات مضامین کے
ذریعے، جو موقت الشیوع رسائل واخبارات میں شائع ہوتے رہے
ہیں، ایک عرصہ سے ہے اور ان سے میری قلمی جنگ بھی رہی ہے
، لیکن نیاز آج تک حاصل نہیں ہوا ہے۔

ابوعلی اثری

www.KitaboSunnat.com

فہرست

۳) آثار وافادات

۴) تحریر و اسلوب تحریر

تعارف

میں نے ۱۹۸۳ء میں بھارت کا سفر اختیار کیا تو اُس کی غرض و غایت یہ بھی تھی کہ اعظم گڑھ میں حاضر ہو کر قرطاس وقلم سے وابستہ اس نادر روزگار شخصیت کی قدم بوسی کا شرف حاصل کروں، جس کی خوبی تحریر نے ایک عرصے سے مجھے اپنا گرویدہ اور اسیر بنا رکھا ہے۔ دلی سے بنارس پہنچا اور جامعہ سلفیہ کو اپنا مستقر بنا کر اعظم گڑھ کے لیے پا بہ رکاب ہوا۔ کچھ دیر کے لیے مبارک پور رُکا اور وہاں شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ مبارک پوری کی زیارت سے شرف یاب ہوا۔ میں ''تذکرہ علمائے مبارک پور'' کی تلاش میں بھی تھا۔ اتفاقاً سر راہے اس کتاب کے مصنف مولانا قاضی اطہر مبارک پوری سے ملاقات ہو گئی اور ان سے اس تذکرے کے دو نسخے حاصل کر کے دل شاد ہوا، مبارک پور کے اس مبارک سفر سے شادکام ہونے کے بعد مئوناتھ بھنجن ہوتا ہوا اپنی منزل مقصود دارالمصنفین اعظم گڑھ جا پہنچا۔ غالباً یہ مولانا عبدالمبین ندوی ہی تھے جو مجھے مولانا ابوعلی اثری کی خدمت میں لے گئے۔ مولانا ایک خاموش اور پرسکون کمرے میں ایک بڑے میز پر سر جھکائے الفاظ و معانی کی دنیا میں مستغرق تھے جب انہیں بتایا گیا کہ گوجرانوالہ سے آپ کا ایک قدر دان اور معتقد ملاقات کے لیے حاضر ہوا ہے تو مولانا دفعتاً اچھل کر کھڑے ہو گئے، حیرت واستعجاب سے میرے چہرے پر نگاہ ڈالی اور بلا تامل و بے تکلف بغل گیر ہوئے۔ مولانا اس وقت کسی کتاب کی پروف ریڈنگ میں ہمہ تن منہمک تھے جو اُن کا پسندیدہ مشغلہ اور ذریعہ روزگار بھی تھا اور اس فن میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

مولانا کے مضامین مختلف علمی و ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے، یہ جس قدر مختصر اور دل آویز ہوا کرتے، قد و قامت میں مولانا اُس سے بھی مختصر اور دل آویز نکلے، سر پر معمولی ٹوپی، پاؤں میں چپل، آنکھوں پر عینک، چوڑی دار پاجامہ اور پرانی وضع کی پیوندوں سے مزین شیروانی' جس نے مولانا کی شخصیت کو باوقار اور دیدۂ زیب بنا رکھا تھا۔ میں مولانا کے انداز

تحریر کی توصیف وتعریف میں حرف بے دام زبان پر لایا تو مولانا کا تھکا ماندہ چہرہ خوشی سے دمک اُٹھا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ یہ ملاقات چند منٹوں پر ہی محیط رہی اس کے بعد ان سے ملاقات کی تمنا بلاشبہ مچلتی رہی لیکن یہ حسرت خط و کتاب تک ہی محدود رہی۔ میں نے ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور اور پندرہ روزہ "ترجمان" دلی میں شائع ہونے والے مختلف شخصیات پر ان کے تاثراتی مضامین بصورت کتاب شائع کرنے کا تقاضا کیا تو مولانا نے فرمایا کہ "یہ فریضہ آپ ہی کو انجام دینا ہوگا" چنانچہ میں نے اہل حدیث شخصیات پر مولانا کے مضامین کو ترتیب دے کر "چند رجال اہل حدیث" کے نام سے شائع کر دیا۔ اس کے بعد سید سلیمان ندوی پر اُن کے مضامین کا انتخاب مرتب کیا اور "علامہ سید سلیمان ندوی" کے نام سے اس کی اشاعت عمل میں آ گئی۔ ان کتابوں کی اشاعت نے مولانا کو ایک نئے حوصلے، ولولے اور عزم سے سرشار کر دیا اور انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد پر شائع شدہ مضامین خود تلاش کر کے برائے اشاعت ارسال فرمادیئے، جو فوری طور پر کتابت کے لئے کاتب کے حوالے کر دیئے گئے یہ کتابت بڑے سائز کے آرٹ پیپر پر خاص اہتمام کے ساتھ کرائی گئی، لیکن جب پروف ریڈنگ کے بعد کاتب نے اپنی بیٹھک تبدیل کر لی اور تلاش بسیار کے باوجود وہ ہاتھ نہ آ سکا تو اس کی اشاعت تعطل کا شکار ہوگئی ۱۹۹۶ء میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری تشریف لائے اور میں نے یہ کتابت شدہ مسودہ ڈاکٹر صاحب کو دکھایا تو اُنہوں نے اس کی بلا تاخیر اشاعت پر زور دیا۔ لیکن کاتب کی عدم دستیابی کے بعد چونکہ یہ مسودہ کتابوں کے ڈھیر میں دب کر رہ گیا تھا اور اب اس سال یہ کتابت شدہ مسودہ ملا تو اسے فوری طور پر کمپوزنگ کے لیے دے دیا گیا اور ابتدائی پروف ریڈنگ کے بعد ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں کراچی بھجوا دیا گیا۔ جنہوں نے نہ صرف کمپوزنگ کی اغلاط کی تصحیح کی بلکہ مبسوط اور معلوماتی مقدمہ بھی زیب کتاب کیا۔ انہوں نے اس کا ٹائٹل بھی مرتب کیا تو اس پر اس خاکسار کا نام بطور مرتب تحریر کر دیا۔ افسوس کہ مولانا آزاد پر اُن کے ایک معتقد اور مداح کے تاثراتی مضامین کتابی صورت میں اُس وقت منظر عام پر آ رہے ہیں، جب وہ خود قید حیات سے آزاد ہو کر اپنے ممدوح کی مصاحبت اختیار کر چکے ہیں۔

مقدمہ

مولانا ابوالکلام آزاد اور ابوعلی اثری

مولانا ابوعلی اثری اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام عبدالباری تھا، لیکن وہ نام سے زیادہ اپنے عرف ابوعلی سے مشہور تھے۔ وہ معاشرے کے ایک متوسط درجے کے خاندان اور اہل حدیث عقیدے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس بات پر انھیں فخر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں صحیح العقیدہ اور متبع کتاب وسنت اَبّ وجدّ عطا فرمائے۔ وہ اپنے نام کے ساتھ اثری لکھ کر بہت شوق کے ساتھ اپنی اس سعادت کا اظہار کرتے تھے۔

ان کی تعلیم کا آغاز مدرسۂ اسلامیہ اعظم گڑھ سے ہوا تھا، جہاں انھیں مولانا خدا بخش سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا خدا بخش نہایت نیک، متبع کتاب وسنت، پیروِ اسلاف، عربی و فارسی زبان و ادب میں صاحبِ نظر، درسیات میں صاحبِ کمال، حالات حاضرہ اور وقت کی سیاسیات وتحریکات کا ذوق رکھنے والے اور الہلال (کلکتہ) کے مطالعے کے بہت شایق بزرگ تھے۔ ان کی خدمت میں ابتدائی کتب کی تکمیل کے بعد کتبِ وسطیٰ کی تکمیل کے مراحل اثری صاحب نے مدرسۃ الاصلاح۔ سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ) میں طے کیے تھے۔

یہ ان کی بڑی خوش نصیبی تھی کہ گھر کے دینی ماحول سے نکل کر انھیں مدرسۂ اسلامیہ کا صاف ستھرا ماحول، نیکوکار اور قابل اساتذہ کی سرپرستی اور تعلیم و تربیت میسر آ گئی اور تعلیم کے دوسرے مرحلے میں انھیں ندوۃ العلماء کی تعلیم و تربیت کا حاصل، قابل ترین، نیکی میں سبقت کرنے والے، حالات حاضرہ اور وقت کی سیاسیات سے باخبر، دین وملت کی خدمت کے شایق،

ایثار پیشہ اور بلند نظر اساتذہ کی رہنمائی اور صحبت میسر آ گئی۔ مدرسۃ الاصلاح کی غیر تدریسی سرگرمیوں میں تحریر و کتابت اور تقریر و مناظرہ کی تربیت کے مواقع میسر آئے۔ مدرسۂ اسلامیہ میں جس ذوقِ دینی کی تخم ریزی کی گئی تھی یہاں اس کے نشوونما کے لیے فضا ساز گار، ماحول کشادہ اور مواقع کثیر تھے۔ مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ میں اثری صاحب نے مولانا محمد شبلی متکلم اور عبدالرحمٰن ندوی نگرامی کا ذکر بہت عقیدت اور فخر کے ساتھ کیا ہے۔ مولانا شبلی مدرسہ کے صدر مدرس اور مولانا نگرامی ان کے جید استاذ تھے۔ دونوں ندوہ کے قابل فخر اور لایق ترین فاضلین میں سے تھے۔ مدرسے کے دوسرے اساتذہ بھی وقت کا بہترین انتخاب تھے۔

مدرسے کی کھلی فضا، تعلیمی و علمی ماحول، فاضل و مشفق اساتذہ کی مجالسِ درس و صحبت نے اثری صاحب کی طبیعت پر خاص اثر کیا۔ ان کا دینی ذوق پختہ ہوا، مطالعے کا شوق پیدا ہوا، نظر میں وسعت آئی، دین و ملت کی خدمت کا جذبہ بیدار ہوا، ملی تحریکات اور قومی سیاسیات سے دل چسپی کا آغاز ہوا۔ غیر نصابی سرگرمیوں سے ان کے خیالات میں پختگی، معلومات میں روز افزوں اضافے اور ذات پر اعتماد کا سفر شروع ہوا۔ کتبِ وسطیٰ کا مرحلہ طے ہوتے ہوتے اور اعلیٰ درجات تک پہنچتے پہنچتے اور جب کہ اعلیٰ درجات کا مرحلہ شروع ہو رہا تھا(۱)۔ ان کی خودی کی تعمیر اور شخصیت کے آخری مرحلۂ تقویم کا تمام سروسامان میسر آ چکا تھا۔ پیش نظر مرحلہ تعمیر سے زیادہ تزئین و آرایش کا تھا۔ ہونہار پوت کے پاؤں تو پالنے ہی میں نظر آ جاتے ہیں۔ لڑکپن میں شخصیت کے خصایص واضح ہوتے ہیں اور مرحلۂ شباب تو حسن کے نمود و نمایش اور نگاہِ شوق کو نظارۂ جمال کی دعوت کا ہوتا ہے۔ اب وہ وقت زیادہ دور نہ تھا کہ اثری صاحب ثابت کریں کہ ان کے ذوق و فکر کا زرِ نقد کتنا اور اخلاص و ایثار کا کیا سرمایہ ہے اور وہ اپنے دین و ملت اور قوم و وطن کی کیا خدمات انجام دے سکتے ہیں؟ اور اسی فیصلے کے اعلان سے وہ اپنی زندگی کے ایک شان دار دور کا آغاز کریں کہ ان پر آسمان ٹوٹ پڑا — ان کے والد گرامی کے انتقال کا حادثہ پیش آ گیا اور حالات نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا۔

ابوعلی اثری صاحب نے حالات پر قابو پانے اور انھیں ساز گار بنانے کی ہر چند کوشش کی لیکن مشیتِ ایزدی نے ان کے لیے جو آزمایش مقدر کر دی تھی، وہ پیش آ کر رہی۔ حالات کے

خودسر گھوڑے کی لگام ان کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی اوران کی آرزو کا محل ڈھے گیا تھا۔انھیں حالات کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا۔وہ رسماً تو ایک مکمل عالم نہ بن سکے۔لیکن تعلیم کا جو مقصد تھا۔ اس سے وہ بالکل محروم نہ رہے،اللہ تعالیٰ نے انھیں ذوقِ علم اورشوق مطالعہ کے ساتھ طبع سلیم،نیکی میں سبقت اور ایک پاکیزہ اور صاف ستھری زندگی گزارنے کی توفیق ارزانی فرمائی۔

اب ان کے سامنے مدرستہ الاصلاح کا پرسکون ماحول،درس کی مجالس،اساتذہ کی فیض رساں صحبتوں اور مذاکرات علمیہ کے بجائے والدہ اور بھائی کے لیے رزق کی جدو جہد کا میدان تھا۔والدگرامی کا انتقال ۱۹۱۸ء میں ہوا تھا(۲)۔سال ڈیڑھ سال کا عرصہ انھوں نے کسی نہ کسی طرح گزارا،لیکن اگست ۱۹۲۰ء میں بالآخر انھیں مدرسہ چھوڑ دینا پڑا اور نئی دنیا کی تلاش میں وہ کلکتہ کے لیے روانہ ہوگئے۔

کلکتہ میں ان کے قیام اور مصروفیات کی تفصیلات مہیا نہیں۔معلوم نہیں وہ اپنے مقصدِ سفر میں کس حد تک کامیاب رہے۔البتہ سیاسی جلسوں،قومی وملی تحریکوں،دینی اجتماعات سے ان کی دل چسپی اوران میں ان کی شرکت کے سراغ اوراکابر ومشاہیر کی دید وشنید کے ذوق کا پتا چلتا ہے۔۱۹۲۰ء کے آخر میں مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی بھی کلکتہ پہنچ گئے۔ترک موالات کے نتیجے میں مولانا آزاد نے جو مدرسہ قایم کیا تھا نگرامی مرحوم اس میں مدرس مقرر ہوئے تھے(۳)اور جب پیغام نکلنا شروع ہوا تو وہ اس کے نہایت فائق صاحبِ قلم اور مستقل لکھنے والوں میں تھے۔یہ تو معلوم نہیں کہ پیغام سے ان کا ضابطے کا بھی تعلق تھا یا نہیں،لیکن مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی گرفتار ہوگئے تو اس کے بعد جو دو تین نمبر نکلے وہ انھی کی محنت کا نتیجہ تھے(۴)۔

زمانہ قیام کلکتہ میں اثری صاحب دن میں اپنے کاموں میں(۵)اور نگرامی صاحب مدرسہ میں درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مصروف رہتے تھے۔شام کو دونوں کلکتہ کی سڑکوں پر سیر کے لیے نکلتے تھے۔نگرامی صاحب اثری صاحب کے اب استاذ ہی نہیں تھے،دوست بھی بن گئے تھے۔اثری صاحب اُن سے بہت متاثر تھے اور بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی!

نگرامی مرحوم مولانا آزاد کی تحریرات سے بہت متاثر تھے،لیکن ان کا پہلا خیال یہ تھا اور

وہ اپنے اس خیال میں تنہا نہ تھے کہ ابوالکلام کی اصل خوبی ان کے علم میں نہیں۔ ان کے طلاقتِ لسانی اور طرزِ بیان میں ہے! لیکن مولانا کا ایک امتحان لینے کے بعد وہ ان کے بہت گرویدہ اوران کے علم وفضل اور وسعتِ مطالعہ ونظر کے بہت قایل ہو گئے تھے۔ بہت دن ہوئے میں نے یہ واقعہ ''الکلام''۔ پٹنہ (ہفت روزہ) میں پڑھا تھا۔ اب یہ واقعہ بہ یک واسطہ اثری صاحب سے خود ممتحن کی زبانی روایت میں پڑھا اور پڑھ کر طبیعت نہایت مسرور ہوئی۔

۱۹۲۱ء کے آخر میں اثری صاحب اعظم گڑھ لوٹ آئے تھے۔ پہلے انھیں چند ماہ ایک قومی اسکول میں پڑھانے کا موقع ملا۔ اس سے فراغت پائی تو دارالمصنفین سے رشتہ استوار ہو گیا۔ دارالمصنفین سے ان کا تعلق ''یک در گیر ومحکم گیر'' کی بہترین مثال ہے۔ یہاں اگر چہ انھیں کوئی خاص منصب حاصل نہ تھا۔ البتہ یہاں انھیں جو ماحول ملا اور جو صحبتیں میسر آئیں وہ ان کے ذوق کے مطابق تھیں اور انھیں صحبتوں کے سرور و کیف کے عالم میں انھوں نے اپنی پوری زندگی گزار دی۔ ان کی ڈایری کے جو اوراق ہمارے سامنے آئے ہیں اور ان کے مضامین کے مطالعے سے ان کے ذوق ومزاج کا جو پتا چلتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ انھیں زندگی کے عیش وراحت اور لذتِ کام و دہن سے کوئی رغبت نہ تھی۔ تھوڑی سی تنخواہ میں سادگی کے ساتھ پوری زندگی سلیقے سے گزار دی۔

دارالمصنفین میں ان کی زندگی کے ۶۸ برس گزرے تھے۔ اس زمانے میں اتنے اہل علم سے ملاقاتیں ہوئیں اور دوستی اور عقیدت و نیاز کے اتنے اصحابِ فضل وکمال سے رشتے استوار ہوئے اور ان کی صحبتوں سے فیض اٹھایا کہ ایسے خوش نصیب بہت کم ملیں گے۔ یہ سلسلہ دار المصنفین کی دنیا سے لے کر باہر کی دنیا میں دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس دور کے جن نام ور اہل علم و ادب کی صحبت انھیں دارالمصنفین میں نصیب ہوئی تھی۔ ایک دور افتادہ نیاز مند کے لیے تو ان کی مکمل فہرست بنانی بھی مشکل ہے۔ البتہ حضرت سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے ابتدائی دور سے لے کر فاضل محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے دورِ حاضر تک دارالمصنفین کے رفقائے علمی وانتظامی کے جن ارکان کے نام یاد آتے ہیں، یہ ہیں؛

مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا ابوالحسنات ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا ابو الجلال ندوی، مولانا ریاست علی ندوی، شاہ معین الدین ندوی، مجیب اللہ ندوی، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی

ندوی، یحییٰ اعظمی، سعید انصاری، مولانا معین الدین ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن وغیرہم۔

ان میں سے بعض کا تعلق بہت مختصر اور بعض کا طویل رہا بلکہ کہنا چاہیے کہ بعض کی پوری علمی زندگی دارالمصنفین سے شروع ہو کر دارالمصنفین ہی میں ختم ہوگئی۔

دارالمصنفین سے وابستگی نے اثری صاحب کے تعلقات کا دائرہ اہل علم ونظر کے وسیع حلقے تک دراز کر دیا تھا۔ دارالمصنفین کے علمی اور ادبی ماحول نے ان کے ذوق کو پختہ کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ کتب خانے کی نظارت اور تحریر و کتابت کی پروف خوانی (تصحیح) کی ذمہ داری نے مختلف دوائر علمی میں ان کے مطالعہ ونظر کو گہرا اور وسیع کر دیا تھا۔ کتب خانے کی نظارت نے چھوٹی بڑی اور ہر علم وفن کی کتابوں تک ان کی رسائی کو آسان بنا دیا تھا اور شوقِ مطالعہ کا تقاضا تھا کہ ہر کتاب کا بالاستیعاب مطالعہ کریں۔ اس علمی ذوق اور شوقِ مطالعہ نے ان کے ذہن کو بعض خاص موضوعات اور شخصیات کے لیے کھول دیا تھا۔ مثلاً: اہل حدیث مکتبِ فکر کی قدیم و جدید شخصیات اور ان کی ادبیات! اس کے علاوہ حضرت مولانا شبلی، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد جن سے انھیں بہت عقیدت تھی!

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی سے انھوں نے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ وہ سید صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہوئے تھے۔ ان کے علوم و معارف سے استفاضے کا جو موقع انھیں ملا تھا، وہ ان کے کسی مرید و معتقد اور علوم و معارف کے کسی شایق کو بھی میسر نہ آیا تھا۔ حضرت سید صاحب کے معارف اور ان کے علمی شہ پارے ان کے قلب پر نقش ہوگئے تھے۔ وہ حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کی شفقتوں کے مورد تھے۔ ۱۹۲۲ء سے لے کر جب تک سید صاحب بھوپال نہیں چلے گئے تھے۔ انھیں سید صاحب کا مسلسل قرب حاصل رہا۔ سید صاحب کی سیرت ایسی نہ تھی کہ کوئی شخص ان کے قریب ہو اور وہ ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ نہ بن جائے۔ ان کے علم کی گہرائی کی تھاہ نہ تھی اور مطالعے کی وسعت ناپیدا کنار تھی۔ کوئی صاحبِ نظر اور شایقِ علم نہ اس گہرائی کا پتا چلا سکتا تھا نہ ان کے مطالعے کی وسعت کی پیمائش کر سکتا تھا اور نہ ان کی علمی عظمت اور جامعیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ اِلاّ یہ کہ ان کے حضور عقیدت و نیاز کا سر جھکا دے۔ ابوعلی اثری صاحب خواہ ان کے علم کی گہرائی اور مطالعے کے حدود کا پتا نہ چلا سکے ہوں اور علوم و معارف میں ان کی جامعیت اور

عظمت کے واقعی مرتبہ شناس شاید وہ نہ ہوں، لیکن سید صاحب کے حسن اخلاق و سیرت کی بے پناہی اور شفقت و محبت کی عالم گیری نے انھیں اپنا مطیع بنالیا تھا کہ اب وہ کسی سے ویسی محبت نہ کر سکتے تھے، اس عقیدت میں نہ شبلی شریک تھے اور نہ ان کی محبت میں ابوالکلام کا کوئی حصہ تھا۔

مولانا شبلی کا انتقال ہوا تو ابوعلی اثری کی عمر تقریباً گیارہ برس کی تھی۔ انھیں شبلی کو دیکھنے کا بھی شاید اتفاق نہ ہوا ہو۔ شبلی کے مطالعے کا دور بھی اس کے کئی برس بعد آیا تھا۔ خود انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ شبلی سے ان کے تعارف کا زمانہ دارالمصنفین سے تعلق (۱۹۲۲ء) کے بعد شروع ہوا۔ البتہ ان کی کتابیں اس سے پہلے مطالعے میں آنے لگی تھیں۔ اس وقت وہ ان کو صرف انشا پرداز کی حیثیت سے جانتے تھے۔ شبلی کے حقیقی مطالعے اور ان کی صحیح واقفیت کا ذریعہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی صحبتیں اور اس کی فضا تھی، جو ان کی محبت اور عقیدت آمیز تذکار سے معمور تھی۔ انھیں ان کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن وہ ان کی زندہ یادگار شبلی اکیڈمی میں بیٹھے تھے، جس کی تعمیر میں خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عشق شامل تھا اور فضا اس عشق کی خوش بو سے معطر تھی۔ جہاں ان کے منصوبہ سیرت خاتم الانبیاء علیہ السلام کی تکمیل کے کاموں میں ہر بزرگ و خورد مصروف تھا اور سیرت نگاری میں جدید دور کا سب سے بڑا کارنامہ انجام پا رہا تھا۔ ابوعلی صاحب اس ماحول اور اس کی فضا میں بسی ہوئی خوش بو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ پھر حضرت شبلی نے تصنیف و تالیف میں جو کارنامے انجام دیے تھے، ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اسلامی علوم و فنون اور اکابر اسلام کے عاشق تھے، تاریخ اسلام کے شناور تھے اور ادب و تنقید کے امام! وہ اردو اور فارسی کے صاحب طرز اور باکمال شاعر تھے۔ ابوالکلام کے بہ قول ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں شبلی پر ختم ہوئی تھی۔ ان کا شمار اردو ادب کے عناصر خمسہ میں ہوتا ہے، لیکن وہ اس دایرے کے اس لحاظ سے سب سے اہم رکن تھے کہ ادبی تنقید، فارسی شعر گوئی اور ذہانت و فطانت میں سب سے فائق تھے۔

عملی سیاست سے ان کا تعلق نہ تھا کہ پیش نظر کاموں کی اہمیت کا نہ کوئی اندازہ شناس تھا نہ کوئی انجام دینے والا! لیکن ان کی مختصر تحریروں اور نظموں نے جو شعور پیدا کیا تھا اور وقت کی

سیاست میں جو رہنمائی کی تھی وہ زمیندار، کامریڈ اور الہلال کی انقلابی تحریکوں سے اہمیت میں کم نہ تھی۔ وقت کے یہ تینوں انقلابی صحافی اور سیاسی رہنما شبلی مرحوم سے متاثر اور ان کے افکار سے کسی نہ کسی حد تک فیض یاب تھے۔ شبلی کی ذہانت، ان کی بصیرت اور نکتہ رسی نے ایک سیاسی شعور اور خاموش فکری تحریک پیدا کی تھی۔ وہ وقت کے بہت بڑے دانش ور تھے۔ ظفر علی اور محمد علی کی تربیت میں ان کا حصہ تھا۔ علی گڑھ کے جمود کو انھوں نے توڑا تھا۔ سرسید کی کاسہلیسی کا وہ جواب تھے۔ الہلال کی انقلابی تحریک میں ان کی فکر شامل تھی۔ ان کی علمی، تعلیمی، سیاسی اور سیرت نگاری کی تحریک نے اس پورے دور کا احاطہ کر لیا تھا۔ دارالمصنفین کی فضا ان کے افکار کی خوش بو سے مہک رہی تھی۔ اس فضا پر ان کے افکار کی روح انقلاب کا قبضہ تھا۔ اس فضا میں کوئی ایسا شخص سانس نہیں لے سکتا تھا جو اس روح اور اس کے تصرفات کا منکر ہو یا اس کی طبیعت میں اسے گوارا کر لینے کی صلاحیت نہ ہو۔ ابو علی اعظمی کی طبیعت میں اثر پذیر ہونے اور حالات سے سازگاری کی صلاحیت موجود تھی۔ ان کی یہ بڑی سعادت تھی کہ وہ دارالمصنفین کی خدمت سے وابستہ تھے۔ ان کے لیے شبلی کی عظمت کا انکار ممکن ہی نہ تھا۔ انھوں نے شبلی کے سامنے عقیدت کا سر جھکا دیا اور صرف جھکایا ہی نہیں نیاز مندی کا حق بھی ادا کیا۔

علامہ شبلی نسلاً راج پوت اور نو مسلم خاندان سے تعلق رکھنے کی بنا پر پُر جوش اور جذباتی تھے اور ان کے ایک استاذ کے ذوقِ حنفیت نے ان کے خون کو مزید گرما دیا تھا۔ وہ اسی کو کل اسلام سمجھ بیٹھے تھے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے لکھا ہے کہ بعض خاص اسباب کی بنا پر جن کا تعلق شبلی کی افتادِ طبع اور ان کے ذوق و عقاید سے تھا، پوری طرح کوئی بھی ان پر اعتماد نہ کر سکا (معارف: سلیمان نمبر، ۱۹۵۵ء)۔ ظاہر ہے کہ ان میں قدیم خیال کے حنفی (دیوبندی، بریلوی) اور اہل حدیث علما تھے اور جدید خیال کے علی گڑھ کے مکتب خیال سے تعلق رکھنے والے تھے۔ بریلوی علما مطلقاً اور دیوبند کی ایک جماعت ان کی مخالف ہی رہی، سرسید کی تعلیمی و سیاسی تحریک کی مخالفت نے اس دائرۂ فکر میں بھی شبلی کا کبھی اعتماد پیدا نہ ہونے دیا۔ اہل حدیث کے لیے شبلی بہ حیثیت نعمانی کے کبھی قابل قبول نہ ہوئے۔ ان کے لیے جو کشش کسی سلفی یا اثری میں تھی، وہ نعمانی میں کبھی نہیں ہو سکتی تھی (٦)۔ خود ہمارے اثری صاحب کی دینی عصبیت قابل داد ہے کہ جب تک انھوں نے

شبلی میں حنفیت کے تشدد میں کمی اور اہل حدیثوں سے بحث و مناظرہ سے ان کے اعراض کو محسوس نہیں کرلیا اور تحقیق سے مطمئن نہیں ہو گئے، شبلی پر انھوں نے قلم نہیں اٹھایا۔ جیسا کہ ''علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد'' (۲۰۰۲ء، اعظم گڑھ) کے مطالعے سے پتا چلتا ہے۔ میں یہ بات ان پر طنز کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں۔ ان کے ذوقِ سلفیت کی خوبی کا اظہار مقصود ہے۔

ابوالکلام آزاد کے نام اور الہلال کے ذکر سے ابوعلی اثری کے کان پہلے پہل مدرسۂ اسلامیہ (اعظم گڑھ) کی فضا میں آشنا ہوئے۔ اس وقت انھوں نے الہلال پڑھا تو خیر کیا ہوگا، صرف دیکھا ہی ہوگا کہ ۱۹۱۴ء مین ان کی عمر ۱۱ برس سے زیادہ نہ ہوگی۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں الہلال بند ہوگیا اور ایک سال کے وقفے کے بعد البلاغ نکلا اور تقریباً پانچ ماہ (نومبر ۱۹۱۵ء تا مارچ ۱۹۱۶ء) اپنی بہارِ جاں فزا دکھا کر وہ بھی بند ہوگیا تھا۔ ابوعلی نے جس الہلال کا ذکر مولانا خدا بخش کے تذکرے میں کیا ہے، وہ شاید البلاغ ہی ہوگا۔ اس لیے کہ وہی زمانہ مدرسۂ اسلامیہ میں ان کے حصول تعلیم کا ہے۔

اس بارے میں شبہ نہ کرنا چاہیے کہ الہلال سے محبت کا اور ابوالکلام سے عقیدت کا بیج اعظمی صاحب کے دل میں ان کے بزرگ استاذ مولانا خدا بخش کے ہاتھوں بویا گیا تھا۔ مدرسۂ اسلامیہ میں انھوں نے ابتدائی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ ۱۷-۱۹۱۶ء میں جب وہ مدرستہ الاصلاح (سرائے میر) میں داخل ہوئے تھے، ان کی عمر ۱۳، ۱۴ برس کی ضرور ہو چکی تھی۔ الہلال و البلاغ دونوں بند تھے۔ اسی لیے یہاں کے تذکار میں الہلال کے انتظار کی بے چینیوں اور شوقِ مطالعہ کی گرم جوشیوں کا انھوں نے ذکر نہیں کیا۔ مولانا آزاد اس وقت رانچی میں نظر بندی کی زندگی گزار رہے تھے۔ البتہ الہلال کے تذکار اور اس کی دعوت کی گونج فضا میں باقی تھی۔ ابوالکلام کے محبین اور الہلال کے شیدائیوں سے ملک کا کوئی گوشہ خالی نہ تھا اور کوئی ملی ادارہ اور مدرسہ و خانقاہ ایسی نہ تھی جس کے مجمعوں میں ابوالکلام اور الہلال کا ذکر لوگوں کے وردِ زبان نہ ہو! مولانا کی نظر بندی نے انھیں ملت کی اور بھی محبوب شخصیت بنا دیا تھا۔ الہلال نے ملی بیداری کی جو تحریک ملک میں پیدا کر دی تھی، اس سے ندوہ اور دارالعلوم دیوبند کے حلقے دوسرے دوائرِ علم و فکر کے مقابلے میں زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ شبلی سے ابوالکلام کے تعلق نے نیاز مندانِ شبلی کے حلقے میں ابوالکلام کو ہر دل

عزیز بنادیا تھا۔

ابوعلی اعظمی اب جس مدرستہ الاصلاح میں گئے تھے وہ شبلی کے ایسے ہی نیازمندانِ شوق اور تربیت یافتگان کا مدرسہ تھا، جن کے قلوب الہلال کی دعوتِ دینی و ملی اور اس کے بانی و داعی ابوالکلام — دونوں کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ مولانا خدا بخش مرحوم نے اعظمی صاحب کے دل میں ابوالکلام سے محبت اور الہلال سے عشق کی جو تخم ریزی کی تھی اس کی سیرابی اور نشوونما کے لیے مدرستہ الاصلاح کی فضا بہت سازگار تھی۔ مولانا حمید الدین فراہی تو ابھی حیدر آباد میں تھے اور ۱۹۲۰ء میں جب اعظمی صاحب نے مدرسہ چھوڑا تھا تو اس وقت تک بھی وطن نہ لوٹے تھے۔ اس لیے حضرت فراہی کے تلمذ و تربیت سے تو وہ مستفیض نہ ہو سکے تھے۔ لیکن یہ بھی ان کی کم خوش نصیبی نہ تھی کہ انھوں نے ندوہ کے قابل اور ذہین ترین فاضلین سے علوم کی تحصیل کی تھی اور تربیت پائی تھی، جن کے سرخیل مولانا محمد شبلی متکلم اور مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی تھے۔ مولانا نگرامی بڑے علمی کمالات، ذہنی صلاحیتوں، مطالعے کی وسعت، پختہ فکر اور محکم سیرت کے مالک اور مولانا ابوالکلام کے خاص شیدائیوں میں تھے۔ مدرسے کے دوسرے اساتذہ بھی شبلی و سلیمان سے ارادت وعقیدت کا رشتہ رکھتے تھے۔ شبلی سے عقیدت و نیاز اور سلیمان سے اخوت و محبت کے رشتے نے ابوالکلام کو بھی اسی خانوادۂ علم و فکر کا رکن بنا دیا تھا۔ اس لیے شبلی و سلیمان ہی کی طرح مدرسہ کی فضا ابوالکلام سے محبت اور الہلال کے تذکرے سے خالی نہیں ہو سکتی تھی۔ اعظمی صاحب نے بڑے شوق اور وارفتگی کے ساتھ مدرستہ الاصلاح میں بیتے دنوں کا تذکرہ کیا ہے۔

ابوعلی اعظمی متوسطات کی تکمیل کے بعد اعلیٰ درجے میں پہنچے ہی تھے کہ انھیں مدرسہ چھوڑنا پڑا۔ یہ اگست ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ انھیں مدرسہ چھوڑنے کا بہت افسوس تھا، لیکن حالات کے سامنے انھیں سپر انداز ہونا پڑا۔ ۲۰ راگست کو وہ کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ تحریک خلافت کا دور تھا اور کلکتہ جیسے شہر میں ہر روز ملک کے کسی لیڈر اور تحریک کے کسی رہنما کی آمد ہوتی۔ آئے دن کسی نہ کسی جماعت کے جلسے کا ہنگامہ برپا رہتا۔ رہنماؤں کے دیکھنے اور انھیں سننے کے مواقع کی کمی نہ تھی، ہر آنے والے دن ہنگاموں میں اضافہ ہوتا رہتا۔ ۱۹۲۱ء کے آتے آتے ترکِ موالات کے

اعمال نے قومی زندگی میں جوش و جذبات کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ ابوعلی صاحب اس نئی دنیا میں تازہ وارد تھے، اس وقت ان کی عمر ۱۷، ۱۸ برس سے زیادہ نہ تھی دل جوش اور ولولوں سے معمور تھا اور نگاہ شوق ہنگاموں اور نئے تماشوں کی متلاشی! جس ماحول کو چھوڑ کر آئے تھے وہ قومی و ملی جذبات کی تربیت گاہ تھی اور کلکتہ جہاں آئے تھے ایک تماشہ گاہ کی مثال تھا۔ ہر شام کو ایک نیا تماشہ دامن کشِ نگاہِ شوق ہوتا۔ اس زمانے کے چند جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت، بعض رہنماؤں کی تقریریں سننے اور انھیں قریب سے دیکھنے کے مواقع کا تذکرہ انھوں نے کیا ہے۔

اسی سلسلے میں مولانا آزاد کے نظارۂ جمال اور ان کی بزم میں شرکت کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہ ان کے ذوق کی خاص چیز تھی۔ اعظم گڑھ اور سرائے میر میں جن رہنماؤں کے تذکار کی لذت سماعت سے گوش آشنا ہوئے تھے، کلکتہ میں ان کے نظارۂ جمال سے آنکھوں نے ٹھنڈک اور دل نے بُعد وغیاب کی مجبوری کے بجائے قرب وحضوری کی خوش وقتی سے تسکین حاصل کی۔ تعجب ہے کہ انھوں نے تلاش معاش کے جس مقصد سے کلکتہ کا سفر کیا تھا، اس کے بارے میں ایک جملہ نہیں لکھا (۷)۔ گویا کہ یہ بات ان کے لیے ہرگز لایق اعتنا نہ تھی۔ ان کا اصل ذوق علمی، ادبی، تہذیبی تھا اور ان کے اعظم گڑھ اور سرائے میر کے اساتذہ کی صحبت وتربیت نے ان کے قومی وملی جذبات کے لیے ان کے ذوق ومزاج کا جو سانچا تیار کر دیا تھا اسی کے تذکرے اور نظارے سے ان کا قلب تسکین پاتا تھا۔ ان کی زندگی کا یہ صفحہ اور اس پر یادوں کی یہ پرچھائیاں وہ شہادت ہے جو ان کے علمی وتہذیبی مذاق اور ملی جذبات کی صداقت پر ثبت ہو گئی تھی!

دارالمصنفین سے ان کی وابستگی (۱۹۲۲ء) سے ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں ان کی شادی ہوئی، متاہل زندگی نے ان پر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا اور اگرچہ حضرت سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے ہوتے ہوئے دارالمصنفین کا کوئی رکن یا کارکن ملک کی قومی، سیاسی زندگی، آزادی کی جدوجہد اور علمی، ادبی، تہذیبی، تعلیمی تحریکات سے بے نیاز اور الگ تھلگ نہیں رہ سکتا تھا۔ نہ اس سے حضرت سید صاحب دامن بچا سکے تھے اور نہ ہمارے ابوعلی اثری اعظمی بچ سکے اور نہ کوئی دوسرا گردوپیش کے حالات اور ان کے اثرات سے

محفوظ رہا۔ لیکن اب ان کی زندگی نے ایک رخ اختیار کر لیا تھا۔ اب ان کے سامنے دارالمصنفین کی خدمت، متاہل زندگی کی ضرورتیں اور بقیہ اوقات میں اپنی بساط بھر علمی و ادبی زندگی اور اسلاف کے تذکارِ مقدسہ اور وقت کے زعما و اکابر کے سوانح، افکار، ان کی دینی اور قومی و ملی زندگی کے فتوحات و خدمات اور اخلاق و سیرت کی تالیف و تدوین کا مبارک نصب العین تھا۔ وہ زندگی بھر اسی راہ پر گامزن رہے اور بڑی سلامت روی کے ساتھ قدم بہ قدم آگے بڑھتے رہے۔ زندگی کے اس دور میں انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق منزل کا تعین کر لیا تھا، اور اپنی استعداد و قوت کے مطابق اپنی رفتار مقرر کر لی تھی۔ اس میں نہ وہ تیز دوڑے، نہ ٹھوکر کھائی، نہ گرے اور نہ راہ کھوٹی ہوئی۔ ان کی میانہ روی، علمی و عملی زندگی کے توازن اور مزاج کے اعتدال نے نہ انھیں راہِ راست سے اِدھر اُدھر ہونے دیا اور نہ ناکامی سے ہم کنار کیا۔ یہاں تک کہ ایمان کی سلامتی اور نفس مطمئنہ کے ساتھ ۳۰ رجنوری ۱۹۹۳ء کی شام کو اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

ابوعلی اثری صاحب نے مولانا شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، اور مولانا ابوالکلام آزاد پر سب سے زیادہ لکھا ہے۔ اسلاف کے بعد ان تینوں بزرگوں سے انھوں نے بہت محبت کی اور ان پر علمی کاموں سے اپنی محبت اور عقیدت کا ثبوت بھی دیا ہے۔ لیکن ان کے حالات و تحریرات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نقطۂ نظر تینوں کے بارے میں الگ الگ ہے۔ مختصر طور پر کہا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ شبلی ان کی مصلحت تھے، سلیمان ان کی ضرورت اور آزاد ان کی عقیدت تھے۔ کسی بات کی تشریح و وضاحت میں اشارہ و کنایہ کا حسن باقی رہتا ہے نہ تاثیر! اشارہ بیان اور دعوت بن جاتی ہے اور کنایے کی روح تاثیر مٹ جاتی ہے لیکن اگر کوئی ہم ذوق اور ہم فکر و ہم مطالعہ نہ ہو تو اشارہ و کنایہ میں فہم کی دشواری بھی پیش آجاتی ہے۔ اس لیے اجمال کی تفسیر، اشارے کی تشریح اور کنایے کی وضاحت بھی ضروری ہوتی ہے۔ وضاحت اس جملے کی یہ ہے:

مولانا شبلی پر اثری صاحب کی تحریرات خاص مباحث تک محدود ہیں۔ علامہ سلیمان ندوی دارالمصنفین کی روح تھے۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کے استاذ اور پیر دو الگ الگ بزرگ تھے۔ دونوں کے ذوق مختلف اور زندگی کے دایرے جدا جدا تھے۔

۱۔مولانا شبلی نعمانی حضرت علامہ کے استاد اور مربی علمی تھے اور

۲۔مولانا اشرف علی تھانوی۔حضرت علامہ کے پیرو مرشد اور رہنمائے سلوک وطریقت تھے۔انھیں حکیم الامت بھی کہا جاتا ہے۔وہ اپنے وقت میں تصوف کے امام تھے،ایک خاص ذوق کے لوگوں کو ان کی شخصیت نے بہت متاثر کیا۔لیکن حضرت سید صاحب کے پیرو مرشد ہونے کے باوجود وہ دارالمصنفین سے باہر کی شخصیت تھے دارالمصنفین کے مقاصد کے دایرے میں وہ فٹ نہ ہوتے تھے۔تھانوی اثرات سے دارالمصنفین کی فضا میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔اس فضا میں تصوف کے اثرات اگر کسی رکن میں کسی درجے میں تھے تو وہ حضرت سید صاحب کی عرفانی زندگی کا اثر تھا۔تھانوی اثرات سے مکمل اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔پھر جو کچھ بھی تھا دارالمصنفین کے دورعروج کی بات نہ تھی آخری دور کے تشابہات تھے۔

حضرت تھانوی فقہ حنفی کو شریعت اور تصوف کو اسلام سمجھتے تھے، اثری صاحب کے عقیدے میں اس کی کوئی گنجایش ہی نہ تھی۔حضرت سید صاحب نے ان کے سامنے تسلیم ورضا کا سر جھکا دیا تھا۔اثری صاحب ان سے بالکل متاثر نہ تھے۔انھوں نے حضرت تھانوی کا کبھی ذکر ہی نہ کیا۔ان کے نزدیک حضرت تھانوی کی مذہبیت سے شبلی کی ادبیت گوارا تھی اور عشق رسالت پناہی اور ذوق سیرت نگاری زیادہ پسندیدہ اور بہت مرغوب تھا۔جن بعض چیزوں کو سید صاحب نے اپنے پیرو مرشد کے ایما پر ترک کر دیا تھا۔سید صاحب کے پاس اس کے خلاف دلایل زیادہ قوی تھے۔حضرت سید صاحب نے مولانا تھانوی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر علمی غیرت کا جنازہ نکال دیا تھا اور حدیث کو تصوف سے رسوا کیا تھا۔کتاب وسنت کے معارف تصوف کے اعمال ورسوم سے بہت زیادہ گراں مایہ تھے۔لیکن ان کے ذوق اور روز وشب کے معمولات سے اس کا بہت کم ثبوت ملتا ہے۔کسی سلفی اور اثری کی غیرت ایمانی تصوف کے رسوم کے مقابلے میں کتاب وسنت کے معارف کی رسوائی گوارا ہی نہ کر سکتی تھی۔

۳۔ابوالکلام کا معاملہ ان دونوں بزرگوں سے مختلف تھا۔ابوالکلام سے اثری صاحب کا معاملہ الحب فی اللہ و البغض فی اللہ کی مثال تھا۔ان کی شخصیت،سیرت اور افکار میں اُن کے لیے زیادہ کشش تھی۔ان کے افادات میں سلفی ذوق کے لیے تسکین کا زیادہ سروسامان

تھا۔ابوالکلام نے کتاب وسنت کے معارف و دعوت، علماے سلف کے تذکار و سیرت اور ان کی دعوتِ عزیمت اور سلف کے خصایص کے بارے میں جو اشارات بھی کیے ہیں وہ فکری اور معنوی حیثیت میں مفصل مقالات پر بھاری ہیں۔ان کے واقعی قدر شناس پیروانِ سلف ہی میں تھے۔ ابوعلی اعظمی کا تعلق فدائیانِ کتاب وسنت کی اسی جماعت سے تھا۔اس لیے یہی ان کا عقیدہ تھا۔اور ابوالکلام پر ان کا لکھنا اپنے عقیدے کا حق ادا کرنا تھا۔

جناب ابوعلی اثری اعظمی نے مولانا ابوالکلام آزاد پر بہت لکھا ہے۔حضرت مولانا شبلی اور حضرت علامہ سید سلیمان ندوی سے بھی تعداد میں زیادہ اور کیفیت میں بھی کم نہیں (۸)۔مولانا کی شخصیت، سیرت، افکار، تصنیفات و تالیفات، ان کے اکابر و اسلاف اور معاصرین کے حوالے سے بھی مضامین کے ڈھیر لگا دیے ہیں۔اس سلسلے میں انھی کے ایک ہم وطن کا نام لیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے شاید اثری صاحب سے زیادہ لکھا ہو۔

ان کی تحریرات کی کمیت کے علاوہ دوسری خوبی کا تعلق تحریرات کا کیفیت سے ہے۔ انھوں نے جو لکھا مولانا آزاد کی محبت سے سرشار ہو کر لکھا۔انھوں نے ہمیشہ مولانا کی کسی خوبی ان کے کسی کمال یا ان کی کسی علمی و دینی خدمت ہی کو موضوع بنایا ہے۔بعض مضامین جو انھوں نے کسی بحث کے سلسلے میں لکھے تھے، ان میں بھی ان کی تنقید کا ہدف ابوالکلام نہیں، ان کے ہم جیسے کم فہم معتقد ہیں۔ابوالکلام کے محاسنِ علم وفکر سے ان کی تحریریں بھری ہوئی ہیں۔وہ مولانا کے نقاد نہیں مداح ہیں، ان کا قلم نکتہ چیں نہیں تذکرہ نگار ہے۔وہ مزاجاً اور طبعاً بھی کسی کی عیب چینی نہیں خوبیوں کی جستجو کرتے ہیں یہ معاملہ ان کا صرف ابوالکلام ہی کے ساتھ نہیں تمام موضوع علیہ شخصیات کے ساتھ ان کا یہی رویہ رہا ہے۔انھوں نے قلم ہی ایسی شخصیات پر اُٹھایا ہے جن کے عقیدہ و عمل، علم وفکر یا سیرت کی کسی خوبی نے انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔وہ رزم کے نہیں بزم کے خوگر ہیں۔

ابوالکلام پر اثری صاحب کے مضامین نوع کے اعتبار سے کئی طرح کے ہیں۔مثلاً

سوانح، سیرت، تنقید، تبصرہ، مشاہدات، واردات، تاثرات، مطالعات، روایات اور مختلف مسایل و مباحثِ علمیہ میں یادگار ہیں۔ اور ان میں ان کے اسلاف و خاندان اور زندگی کے مختلف ادوار و دوایر اور افکار و خدمات کے بارے میں نہایت قیمتی معلومات جمع ہو گئے ہیں۔

ان کے مضامین ہر طرح کے اِدّعا سے عاری ہوتے ہیں۔ وہ مضامین کا مواد اپنے ذوق کے مطابق فراہم کرتے ہیں اور اپنے نقطۂ نظر سے انھیں تالیف کرتے ہیں۔ وہ کتاب و سنت کے شیدائی اور اسلاف کرام کے سچے پیروکار ہیں۔ وہ کشادہ دل اور فراغ حوصلہ ہیں۔ رواداری ان کا شیوہ ہے۔ اگر عقیدے کی بنا پر ان کا رجحان کسی شخصیت کی طرف کم و بیش ہو تو یہ ایک فطری بات ہے۔ انھیں اس بات کا حق ہے کہ وہ کسی سے ٹوٹ کر محبت کریں یا کسی سے واجبی راہ و رسم اور علم و ادب کے کسی خاص دایرے تک تعلقات کو محدود رکھیں یا کسی کے تذکرے سے قلم کو آلودہ کیے بغیر بے نیازانہ گزر جائیں۔ وہ اپنے موضوعاتِ تحریر کے انتخاب میں بہت محتاط تھے اور ایک حد تک مصلحت پسند بھی واقع ہوئے تھے۔

اگرچہ یہ تمام مضامین ابوالکلام آزاد پر یا ان کے حوالہ و رشتہ سے بعض دیگر قریبی شخصیات و موضوعات اور مباحث میں ہیں۔ لیکن انھیں مضامین کے حروف و سوادِ تحریر میں اُن کی اپنی شخصیت کے خدوخال اور زندگی کے احوال بھی چھپے ہوئے ہیں اور ذوق و مزاج و سیرت کے سرایر و خفایا ظاہر ہوتے چلے گئے ہیں۔ یہ ابوالکلام ہی کی نہیں، ان کی اپنی بپتی اور زندگی کے نشیب و فراز کی کہانی بھی ہے۔

اگر کوئی صاحبِ ذوق چاہے تو ان مضامین کی روشنی میں ابوالکلام کی ایک نئی داستانِ حیات مرتب کر سکتا ہے اور اگر ان مضامین کے مؤلف پر کوئی شایق دادِ تالیف و تحقیق دینا چاہے تو اس کی حیات و افکار کی تزئین کے لیے مضامین کا ایک ایک صفحہ اس کے دامن شوق کو گوناگوں افکار و معلومات سے مالا مال کر دے گا۔

ابوعلی اثری اعظمی نے ابوالکلام کے بارے میں جو لکھا ہے، اس میں ابوالکلام سے ان کی محبت اور اخلاص کا عنصر بنیادی اور سب سے زیادہ ہے۔ انھوں نے سچائی اور دیانت داری کے

ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے پیش نظر کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا۔ ان کا قلب لوث و لالچ سے یقیناً پاک تھا۔ وہ مطالعے اور ان سے اخذ کردہ نتائج، اپنے مشاہدات اور تاثرات بیان کرنے میں آزاد تھے۔ انھیں اس کا قطعی حق حاصل تھا اور کئی اسباب کی بنا پر انھیں کم از کم مجھ خاکسار اور اپنے اِس دور افتادہ نیاز مند پر تفوق اور کئی ترجیحات حاصل تھیں۔ وہ بزرگ اور جہاں دیدہ تھے۔ ان کی عمر، ان کا مکتبی علم، ان کے مطالعے کے مواقع، تصنیف و تالیف کی فرصت و فراغت، ان کے گوناگوں مشاہدات اور زندگی کے بے شمار تجربات نے اُن میں اور اُن کے اس نیاز مند کے درمیان اتنے فاصلے پیدا کر دیے تھے جنھیں یہ کم سواد نیاز مند کبھی دور نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے ستاسی برس، اور بچپن کے دس برس نکال کر بھی ستتر برس میں اتنے بزرگوں کی خدمت کی اور ان کے درس و تعلیم اور علم و عرفان کی صحبتوں سے فیض اٹھایا تھا، جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے اڑسٹھ برس (۱۹۲۲ء تا ۱۹۹۰ء) دار المصنفین اعظم گڑھ کی خدمت میں بسر کیے اور تیئس برس (۱۹۲۲ء تا ۱۹۴۵ء) حضرت سید اعظم علامہ مولانا سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہٗ کی صحبتوں سے فیض اٹھایا۔ افسوس! مجھے ان میں سے کوئی سعادت بھی نصیب نہ ہوئی۔

اس کم نصیبی پر ستم یہ ٹوٹا کہ حضرت اثری صاحب کو میرے بارے میں نکتہ چینی کا شبہ ہوا۔ حال آں کہ میں اپنے بزرگ پر نکتہ چینی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں ابوالکلام کا ایک دور افتادہ عقیدت کیش ہوں اور اثری صاحب کا نکتہ چیں نہیں خوشہ چیں ہوں۔ میں نے ان کی تحریرات سے استفادہ کیا ہے۔ میں ان کا مخالف نہیں نیاز مند ہوں۔ میں نے ان کے خلاف نہیں ان کی رائے کی تائید میں لکھا ہے۔ لیکن یہ بھی میرا عقیدہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کی تحقیق اور رائے ہے۔ ان کا ارشاد قرآن و حدیث اور کتاب و سنت نہیں۔ ان کے ارشادات پر ایمان لانا اور ان کی رائے سے اتفاق کرنا ہرگز ضروری نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات و تاثرات اور تحقیقات و آرا پوری صفائی کے ساتھ مناسب اسلوب میں ابوسلمان غریب پر غصہ و ناراضگی کی آمیزش و تزئین کے ساتھ بیان کر دی ہیں۔ لیکن یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے مضامین کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ جو ابوالکلام سے اخلاص، مضامین کے حسن پیش کش، زبان کی صحت اور اسلوب کی طرفگی سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں بعض باتیں خود ان کے علم و فضل کے منافی اور ان کے ذوق و

معیار سے کم درجے کی بھی ہیں۔ لیکن یہ ایسی بات نہیں ہے جس پر زبان طعن دراز کی جائے، یا حافظے کی لغزش یا قلم کے سہو کے لیے مجلس ماتم کا اہتمام کیا جائے۔ اس قسم کی لغزشیں تو شبلی، سلیمان اور آزاد سے بھی سرزد ہوئیں اور ان کے سہو قلم کی مثالیں موجود ہیں جن کے لیے ان کے مخالفین نے انھیں معاف نہیں کر دیا تھا۔ اس سے ہم اپنے آپ کو کب بری سمجھتے ہیں جس کے لیے ہم اثری صاحب سے شکوہ سنج ہوتے، لیکن ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ جو بات وقوع میں نہیں آئی تھی اور جو فعل سرزد نہیں ہوا تھا، اثری صاحب نے ''احتساب'' میں اس کا ذکر کر کے اسے تاریخ بنا دیا!

مناسب ہوگا کہ اس ناکردہ گناہ کی حقیقت بھی بیان کر دی جائے!

واقعہ یہ ہے کہ الہلال کے ایک مضمون مشہدا کبر کے بارے میں بحث چھڑی کہ وہ مضمون حضرت سید صاحب کا ہے یا مولانا آزاد کا؟ میں نے اس کے بارے میں وہی بات لکھی جو محترم اثری صاحب نے لکھی تھی کہ مضمون مشہدا کبر مطبوعہ الہلال مورخہ ۱۳/اگست ۱۹۱۳ء سید صاحب کا ہے۔ یہی رائے مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی تھی اور مجھے خوشی ہوئی کہ اس مضمون کی اشاعت کے بعد اس موضوع پر بحث اور ردوکد ختم ہوگئی، افسوس! اثری صاحب نے مجھے لائن کے اُس پار کا فرد سمجھ لیا اور طنز وتنقید کے تیروں کا حدف بنا لیا (۹)۔

دوسری بات جس پر ہمارے بزرگ کو غصہ آیا یہ ہوئی کہ میں نے اپنے ایک مضمون میں مرزا فضل الدین احمد کو مولانا آزاد کے ''تذکرہ'' کا مرتب لکھ دیا تھا۔ میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ ''تذکرہ'' سے ان کا کیا تعلق بتایا جائے؟

۱۔ اس لیے کہ وہی اس کی وجہِ تالیف تھے۔ انھی کے اصرار سے مجبور ہو کر مولانا آزاد نے تذکرہ کے اوراق یا مضامین لکھنے شروع کیے تھے۔

۲۔ مولانا یہ اوراق لکھ لکھ کر انھی کو بھیجتے جاتے تھے اور وہ انھیں رکھتے جاتے تھے۔ جب دیکھتے تھے کہ مولانا کا قلم رک گیا ہے تو انھیں توجہ دلاتے اور لکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ اس طرح ان کی کوشش کی بہ دولت یہ قیمتی ذخیرہ جمع ہوتا رہا اور مولانا کی تالیفات میں شاہ کار کی حیثیت سے شہرت پائی۔

۳۔ پھر انھی نے مولانا کے علم میں لائے اور ان کی اجازت کے بغیر اسے کمپوز کرانا شروع کر دیا۔ جب مولانا کے علم میں یہ بات آئی تو اس کا بڑا حصہ کمپوز ہو چکا تھا اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ خاموش ہو جائیں اور مرزا صاحب جو کر رہے ہیں وہ انھیں کرنے دیں۔

۴۔ مولانا نے اس کا ایک پروف ضرور دیکھا تھا اور اپنی معذرت میں ایک تحریر لکھ کر بھیج دی تھی۔ جس میں یہ ساری صورت حال بیان کر دی تھی۔ پھر سید صاحب کے نام ایک خط میں یہ کہانی دہرائی تھی۔

۵۔ مرزا فضل الدین نے اپنی ایک تحریر اس کے ساتھ بہ طور پیش لفظ چھاپ دی تھی۔

۶۔ اس کی طباعت کا انتظام بھی انھی مرزا صاحب نے کیا تھا۔ لیکن ضابطے کے مطابق وہ پرنٹر اور طابع بھی نہ تھے اس لیے کہ پریس (البلاغ) کے مالک وہ نہ تھے۔

۷۔ اس کی فروخت کے ذمہ دار وہی تھے۔ یہاں تک کہ مولانا کسی اخبار کے مالک یا مدیر کو جس نے اپنے اخبار میں ''تذکرہ'' کا اشتہار چھاپ دیا تھا یا تبصرہ کیا تھا۔ ایک نسخہ بھجوانا چاہتے تھے۔ لیکن فضل الدین اس سے اعراض فرما رہے تھے۔ حال آں کہ وہ اس کے مالک تھے نہ پبلشر!

سوال یہ ہے کہ وہ مرتب نہ تھے، پرنٹر نہ تھے، مالک نہ تھے اور پبلشر بھی نہ تھے۔ اگرچہ یہ تمام امور انھی نے انجام دیے تھے۔ اس کے بعد ''تذکرہ'' کا پورا اسٹاک انھی کے قبضہ و تصرف میں تھا، تو پھر وہ کیا تھے؟ کسی تحریر و بیان میں ''تذکرہ'' کے پہلے ایڈیشن کے حوالے سے ان کے تعلق کو کس حیثیت میں ظاہر کیا جائے؟ جس وقت میرے قلم سے ان کے لیے مرتب کا لفظ نکلا تھا تو اِن خیالات سے میرا ذہن بالکل نا آشنا تھا۔ میرے خیال میں تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہ تھا اور ایسا تو ہرگز نہ تھا کہ اثری صاحب اس کے لیے زحمت کش رنج یا گرفتارِ الم ہو جائیں اور اپنے ایک نیاز مند سے کبیدہ خاطر ہو بیٹھیں!

مجھے یاد نہیں کہ تذکرہ کے آخری ساہتیہ اکادمی دہلی ایڈیشن میں اس کے مدون جناب مالک رام نے تذکرہ سے ان کے تعلق کے اظہار کے لیے کیا اصطلاح استعمال کی ہے۔ اگر مالک رام زندہ ہوتے تو ان سے پوچھتا کہ انھوں نے اپنے ایڈیشن میں مرزا صاحب کی تحریر کو برقرار رکھا

ہے تو ان کی کیا حیثیت پیش نظر تھی؟

میں نے عرض کیا تھا کہ اثری صاحب نے ابوالکلام کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وہ انھوں نے اپنی زبان میں، اپنے اسلوب میں اور اپنے علم و مطالعہ اور تحقیق کی روشنی میں، اپنے مشاہدے اور رائے کے مطابق ابوالکلام سے کمال درجہ محبت اور عقیدت سے لکھا ہے۔ کسی کے خلاف لکھنا یا طنز و تعریض سے کام لینا ان کے ذوق و مزاج کے خلاف تھا۔ شبلی، سلیمان اور آزاد کے بارے میں تو کسی ایسی بات کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا، اس بات کے لیے ایک بڑا استدلال یہ ہے کہ ابوالکلام کا تعلق دارالمصنفین کے بانیوں، مشیروں، مربیوں اور محسنوں میں ہوتا ہے۔ اس کا کوئی رکن اور کارکن یا رفیقِ علمی ان کی ذات سے مخالفت کو اپنا رویہ نہیں بنا سکتا گذشتہ نوے برس سے دارالمصنفین کی یہ روایت ہے۔ اس کے حلقے میں ہمیشہ ان کا احترام کیا گیا ہے۔ کبھی جذبات میں کسی کے منہ سے کوئی بات نکلی ہو تو اس سے اس روایت کی نفی نہیں ہو جاتی۔ اثری صاحب کا تو مزاج ہی صلح پسندانہ تھا۔ نزاع و اختلاف سے وہ ہمیشہ دور و نفور رہتے تھے اور جہاں کوئی ایسی بات ہوتی وہ پہلو بچا کر نکل جاتے تھے۔ انھوں نے دارالمصنفین کی اخلاقی اور اصولی پالیسی کا بھی ہمیشہ احترام کیا۔ مولانا شبلی، علامہ سید سلیمان اور مولانا ابوالکلام ان کے ممدوحین میں تھے۔ سب کے بارے میں ان کا یہی مسلک رہا۔ بزرگوں کے بیچ ان کے صلح کل کا یہ مشرب اور رواداری کا یہ رویہ مجھے اچھا لگا۔

وہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں یہ امتیاز رکھتے ہیں کہ انھوں نے مولانا آزاد پر سب سے زیادہ مضامین لکھے اور اب ان کے مضامین کا جو مجموعہ آ رہا ہے۔ اس کی اس خوبی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مولانا پر کسی ایک صاحب قلم کے سب سے زیادہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ زبان و بیان کے حسن اور اسلوب تحریر کی دل آویزی، مضامین کی اہمیت اور ان کے مطالب کی افادیت میں بھی اس کا کوئی جواب نہیں۔ امید ہے کہ ابوالکلام کے عقیدت مندوں، ندوہ و دارالمصنفین کے حلقوں اور ادب کے شائقین میں بھی اسے پسند کیا جائے گا۔

حواشی:

(۱) اثری صاحب نے مدرسہ چھوڑا تو وہ حدیث میں مسلم شریف، فقہ میں ابن رشد کی بدایۃ المجتہد، اصول فقہ میں نورالانوار، ادب میں ابو تمام کا حماسہ، کلام و عقاید میں مفتی عبدہ مصری کی کتاب التوحید وغیرہ پڑھ رہے تھے۔ (علامہ سید سلیمان ندوی: ص ۱۵) اور لب بام پہنچ ہی چکے تھے۔ اگر والد ماجد کے انتقال کا سانحہ پیش نہ آ گیا ہوتا تو صرف دو برس کی محنت اور صبر و استقامت سے والد گرامی کے خواب کی تعبیر بن چکے ہوتے اور ایک مدرسۂ اسلامیۂ عربیہ کے فارغ التحصیل ''مولانا'' کہلانے کے مستحق ہو جاتے۔ دارالمصنفین کے دائرۂ اثر میں تو انھیں ان کی دین داری اور حسن سیرت ہی کی وجہ سے ''ملا جی'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں کبھی سب سے بڑے عالم کو ''ملا'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا اور اسی میں اس کے علم کا اعتراف اور شخصیت کا احترام موجود ہوتا تھا۔ حضرت اثری صاحب کے اس تلقب میں ان کے والد کی روح کی تسکین کا کافی سامان تھا۔

(۲) والد ماجد کا انتقال ۱۸؍ نومبر ۱۹۱۸ء کو ہوا تھا۔

(۳) مدرسۂ اسلامیہ ۱۹۲۰ء کے آخر میں مدرسۂ عالیہ۔ کلکتہ سے نکلنے والے طلبہ کے لیے مسجدِ ناخدا میں قایم کیا گیا تھا۔ ۱۳؍ دسمبر کو گاندھی جی نے اس کا افتتاح کیا تھا۔ مولانا آزاد اس کے سرپرست، مولانا ملیح آبادی مہتمم، مولانا حسین احمد مدنی صدر مدرس اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اس کے بہت اہم اور مستعد مدرس تھے۔ ایک ڈیڑھ برس مدرسہ جیسے تیسے چلتا رہا۔ مسجد ناخدا کے وقف سے اس کے مصارف پورے ہوتے تھے۔ لیکن کمیٹی کے صدر اور بعض اراکین اس کے قیام ہی کے مخالف تھے۔ ادھر یکم دسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا ملیح آبادی اور ۱۰؍ دسمبر کو مولانا آزاد گرفتار ہو کر جیل گئے اور مدرسہ کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو گیا۔ ۱۹۲۲ء میں مدرسہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ البتہ ناظرہ خواندگی کا ایک معمولی مدرسہ رہ گیا۔

(۴) پیغام کا پہلا شمارہ ۲۳؍ ستمبر کو نکلا تھا اور تیرھواں شمارہ جو اس کا آخری شمارہ بھی تھا ۱۶؍ دسمبر ۱۹۲۱ء کو شایع ہوا تھا۔ پھر ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ پیغام میں مولانا عبدالرحمٰن ندوی گرامی نے جو مضامین لکھے تھے، وہ ''آزادی کا سفر'' کے عنوان سے کتابی شکل میں بھی شایع ہو گئے تھے۔

دینی، سیاسی، تعلیمی موضوعات پر ان کے کئی رسایل کی نشان دہی مولانا سید سلیمان ندوی نے کی ہے۔ ۶؍مارچ ۱۹۲۶ء کو ندوہ کا یہ لعل شب چراغ ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا۔

(۵) بہ شرطے کہ اثری صاحب نے کوئی خاص معروفیت اپنے لیے وہاں پیدا کر لی ہو۔

(۶) لیکن کیا شبلی کی عظمت کے اعتراف کے لیے یہ کافی نہیں کہ شبلی کے تلامذہ اور معتقد اہل علم ونظر کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس نے نئی مسلم سوسایٹی میں نہ صرف اپنی جگہ بنائی بلکہ شبلی کے لیے بھی اعتماد اور تکریم کی فضا پیدا کر دی اور آج اسے شبلی مکتبِ فکر یا شبلی اسکول کے نام سے اسی طرح پہچانا جاتا ہے جس طرح وقت کے دوسرے مکاتبِ فکر! اس مکتب فکر کے سرخیل سید سلیمان ندوی اور مرکز دارالمصنفین ہے۔ لیکن اس کے مکتبِ فکر بنانے میں ابوالکلام کا بھی بہت حصہ ہے۔

(۷) اب ''علامہ سید سلیمان ندوی'' ان کا مجموعہ مضامین نظر سے گزرا تو دیکھا کہ اس میں ایک جملہ موجود ہے ''سوا سال کے بعد کلکتہ سے نامراد واپس آیا'' (صفحہ ۱۵) یہ جملہ آپ اپنی تفصیل بھی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں گھر لوٹ آئے تھے۔

(۸) حضرت مولانا شبلی پر ابو علی اعظمی کے گیارہ مضمون ہیں۔ حضرت سید صاحب پر ان کے مضامین کی تعداد اٹھائیس ہے۔ جب کہ مولانا آزاد پر ان کے پینتالیس مضامین ہیں۔ ان میں بہت سے ایسے مضامین ہیں جو ایک دوسرے کے مابین تعلقات یا ایک دوسرے کے بارے میں آرا پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین، شبلی و آزاد، شبلی و سلیمان، آزاد و سلیمان اور کچھ مضامین میں ان بزرگوں کے ساتھ دوسری علمی و ادبی شخصیات اور مشاہیر ہم ردیف ہیں۔ یہ تمام مضامین

۱۔ ''علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد'':

(الف) ذکر شبلی: ۱۱ مضامین

(ب) تذکرۂ آزاد: ۲۲ مضامین+

۲۔ ''علامہ سید سلیمان ندوی'': ۲۸ مضامین

۳۔ ''مولانا ابوالکلام آزاد'': ۲۳+ مضامین

مذکورۂ بالا مجموعہ مولانا ابوالکلام پر ان کے مضامین کا زیرِ نظر مجموعہ ہے۔ لیکن تینوں بزرگوں پر ان کی تحریرات کا یہ کل سرمایہ نہیں۔ اول الذکر کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا کہ ان پر کوئی مضمون مجموعے میں جگہ پانے سے رہ گیا ہے۔ لیکن سید صاحب کے بارے میں میرا یہی خیال ہے۔ البتہ ابوالکلام پر اثری صاحب کے کئی مضامین میرے علم میں ایسے ہیں جو کسی مجموعے میں جگہ نہیں پا سکے ہیں۔

(۹) میں شروع ہی سے اس بحث کو مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ میرا مقصد بحث میں حصہ لینا نہ تھا، بلکہ بحث کو ختم کرانا چاہتا تھا۔ لیکن میری طالب علمانہ حیثیت اس بات میں کچھ سود مند نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے مضمون لکھا تو پہلے اسے مولانا غلام رسول مہر مرحوم کی خدمت میں پیش کیا۔ میں اس سلسلے میں ان کی رائے معلوم کر لینا چاہتا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ انھوں نے میری رائے کو نہ صرف درست سمجھا بلکہ اس کی تائید میں تفصیل سے اظہارِ خیال فرمایا اور کئی فکر انگیز اور حقیقت افروز دلایل سے اس رائے کو قولِ فیصل بنا دیا۔ خاکسار کا یہ مضمون ''قولِ فیصل -- الہلال کا ایک مضمون: مشہدِ اکبر'' کے عنوان سے ہماری زبان۔ علی گڑھ کی اشاعت ۲۲ر فروری ۱۹۶۷ء میں چھپ گیا تھا۔ مولانا مہر مرحوم کی تائید مزید وقوی کا یہ اثر ہوا کہ بحث اسی مقام پر ختم ہو گئی۔ کاش! اثری صاحب مضمون پر میرا نام ہی نہ دیکھتے، اس کے مطالب و مقصود پر بھی نظر ڈال لیتے تو انھیں رنج کی یہ کوفت نہ اٹھانی پڑتی!

دیباچہ

مولانا ابوعلی اثری کا شمار اردو کے ان ''قلم کے مزدوروں'' میں ہوتا ہے جو گزشتہ ۶۰ ساٹھ برسوں سے اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے مختلف علمی وادبی موضوعات پر برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں لیکن ان ۶۰ ساٹھ برسوں کی ان کی کمائی اس گردِ سفر کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے، جو گردش روزگار نے ازراہ ترحم ان کے دامن میں ڈال دی ہے۔ اب جبکہ ان کی عمر کا عشرۂ نہم بھی نصف ہونے کو آیا ہے، جناب ضیاء اللہ کھوکھر کی علم شناسی اور علم دوستی نے ان کے اس مجموعہ مقالات کو شائع کر دیا ہے جو مولانا سید سلیمان ندویؒ کی زندگی، رجحانات اور بعض علمی کارناموں کا احاطہ کرتا ہے۔ اب مولانا اثری کا دوسرا مجموعہ مقالات کھوکھر صاحب ہی کی توجہ اور نظر کرم سے منظر عام پر آ رہا ہے جو ان کے ان مقالات پر مشتمل ہے جو مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے۔ گویا اب گردشِ روزگار نے گردِ سفر کے علاوہ ان کے دامن میں کچھ پھول بھی ڈالنے شروع کر دیے ہیں، خدا کرے ان پھولوں کی خوشبو تا دیر قائم رہے اور حالات کی تمازت ان کو جلد کملانے نہ پائے۔

مولانا اثری نے مشرقی یو پی کے مردم خیز خطہ اعظم گڑھ میں ۱۹۰۳ء میں اس جہانِ رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد اگرچہ ایک معمولی پڑھے لکھے شخص تھے مگر علماء وفضلاء کے صحبت یافتہ تھے۔ اس لئے ان کی تمنا تھی کہ مولانا اثری بھی عالم بنیں۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ واقع باغ میر پیٹو اعظم گڑھ میں ہوئی جہاں ان کو ایک اہل حدیث عالم مولوی خدا بخش صاحب مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ مولوی خدا

بخش کے انتقال کے بعد ان کو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں داخل کیا گیا، اس وقت مولانا شبلی متکلم ندوی اس کے صدر مدرس و مہتمم اور مولانا حمید الدین فراہیؒ ناظم تھے۔ مدرسۃ الاصلاح میں بھی انہوں نے متوسطات تک ہی کی تعلیم حاصل کی تھی کہ پورا ہندوستان اس وبائی انفلوئنزا بخار کی لپیٹ میں آ گیا، جس نے ہزاروں گھروں کو بے چراغ کر کے رکھ دیا۔ مولانا کے والد بھی اسی انفلوئنزا بخار میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیارے ہوئے۔ جس کے نتیجے میں مولانا کو اپنی تعلیم نامکمل چھوڑنی پڑی اور تلاش معاش میں کلکتہ کی خاک چھاننے پر مجبور ہوئے جہاں ان کے کچھ نزدیکی اعزہ مقیم تھے۔ وہ مصیبت کے دن انہوں نے کس طرح کاٹے، صبر کے کن کن مراحل سے گزرے، شدائد و مصائب کے کیسے کیسے طمانچے سہے، اس کا ذکر مولانا ابوعلی اثری نے نہ تو کبھی زبانی طور سے کیا اور نہ ہی تحریری طور پر۔ پھر نہ جانے کن اسباب کے تحت ۱۹۲۳ء میں ان کو دارالمصنفین میں پہلے کتب خانہ کی مہتمی اور پھر مصحح کی اسامی پر رکھ لیا گیا۔ وہ دن اور آج کا دن ہے یہ قلم کا مزدور کاپیوں اور پروفوں کی تصحیح کر کے اپنے جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

معلوم نہیں آپ دارالمصنفین گئے ہیں یا نہیں؟ اگر آج بھی آپ کو وہاں جانے کا موقع ملے تو جو صاحب وہاں پر سب سے زیادہ سن اور قد میں سب سے مختصر نظر آئیں آپ آنکھ بند کر کے یقین کر لیجئے کہ مولانا اثری یہی ہیں وہ یا تو تازہ کتابوں کی کاپیاں اور پروف دیکھ رہے ہوں گے یا حکیم جی کے نسخے والے کاغذ پر اپنا کوئی مضمون تحریر کر رہے ہوں گے پہلی نظر میں آپ ان کو دیکھ کر اندازہ بھی نہ کر پائیں گے کہ اس نحیف الجثہ اور مختصر سے انسان میں قدرت نے کتنی بجلیاں چھپا کر رکھ دی ہیں۔

موجودہ عہد کے دارالمصنفین میں ان سے زیادہ پرانا کارکن کوئی اور نہیں ہے۔ اس ادارہ کی خدمت کرتے ہوئے ان کو پچاس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس لحاظ سے اگر ان کو دارالمصنفین کا برادرخورد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے اس ادارے کی گفتنی و ناگفتنی سب کا بچشم خود مشاہدہ کیا، گفتنی کی تو وہ اپنے قلم کے ذریعے برابر تشہیر کرتے رہے مگر ناگفتنی کو بار امانت کی طرح اپنے سینے میں چھپائے رہے۔ وہاں

گفتنی و نا گفتنی سب کچھ ہوتا رہا اور مولانا اثری پروف بھی پڑھتے رہے اور اپنے مقالے بھی لکھتے رہے گویا وہ اس ادارہ میں ایک ایسے درخت کی طرح رہے جس پر کسی بھی موسم کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ انہوں نے سید صاحب کا دور نظامت دیکھا، شاہ صاحب کے ماتحت بن کر دن کاٹے، صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی دار و گیر سے خالف رہے ہیں۔ مگر وہ خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کے اس شعر

کتنوں کی کمر جھک گئی اس دور خرد میں
دیوانہ مگر اب بھی اسی طرح جواں ہے

کی تصویر بنے اپنے کام میں مشغول ہیں۔ آج بھی جبکہ وہ اسی سال سے اوپر کے ہو چکے ہیں خاصہ دور کا فاصلہ طے کر کے پیدل دارالمصنفین آتے ہیں اور جوانوں بلکہ نوجوانوں کے شانہ بہ شانہ پورے دن کام میں مصروف رہ کر اپنے کلبۂ احزان کو واپس جاتے ہیں۔

مولانا اثری اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی مرحوم سے متاثر ہیں اور ان کا ذکر بڑے ہی ادب و احترام سے اب بھی کرتے رہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کو زیادہ عمر نہ ملی ورنہ ممکن ہے کہ مولانا اثری ان کا مثنیٰ بن کر مدرستہ الاصلاح سے فارغ التحصیل ہوتے۔ بہر حال مولانا نگرامی کی تربیت کا یہ نتیجہ ہے کہ کاپیاں پڑھتے وقت علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے علاوہ کسی بھی مصنف کی مضمون نگار کی عبارت ان کی اصلاح سے نہیں بچتی تھی کہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی عبارتوں پر بھی "مشق ستم" فرما دیتے جس کو سید صاحب کمال حلم سے جھیل جاتے، اس سلسلے میں مولانا اثری اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے اکثر جھپٹ ہوتی رہتی جس سے مولانا اثری آزردہ خاطر ہو جاتے مگر اپنی مشق ستم سے پھر بھی باز نہیں آئے۔

مولانا نے باقاعدہ تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل نہیں کی یہی وجہ ہے کہ وہ بلا مبالغہ صدہا مقالات لکھنے کے باوجود کوئی مستقل اور مربوط تصنیف پیش کرنے سے قاصر رہے۔ ان کے تمام مقالات وقتی تاثر کا نتیجہ ہیں جو زیادہ تر ایک ہی نشست میں معرض وجود میں آئے ہیں۔ وہ جوش انشا پردازی میں اکثر اپنے موضوع سے اس طرح گریز

فرماتے ہیں کہ اُس کا اصل سرا ہاتھ آنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کسی ایسے پیشے سے منسلک ہوتے جہاں مطبوعہ مقالات کی تعداد پر ترقی کا انحصار ہوتا تو وہ اس بات پر ضرور قادر ہوتے کہ وہ اپنے ایک مقالے سے چار مقالے بنا لیں لیکن چونکہ اس طرح کی کوئی ضرورت ان کو زندگی بھر نہیں پڑی اس لیے وہ اپنے ایک مقالے میں چار مقالوں کا مواد کھپاتے رہے جس کا نتیجہ اکثر حالات میں یہ نکلتا ہے کہ پیشانی کے عنوان اور مقالے کے مندرجات میں ایک ربط خفی کے علاوہ ہاتھ کچھ نہیں آتا، مگر اس کے باوجود ان کی تحریروں کی دلکشی اور علامہ شبلی کے طرز کی کامیاب پیروی ان کے مقالات کے اس نقص کی پردہ پوش بن جاتی ہے۔

اس سے ربع صدی پہلے تک مولانا اثری صرف اخبارات میں اپنے مضامین شائع کرواتے تھے۔ میں جب ان کا ''منہ لگا'' ہو گیا تو میں نے ضد کرنی شروع کی کہ آپ اپنے مقالات رسائل میں بھیجیے۔ اگر مجھ کو صحیح یاد ہے تو ان کا سب سے پہلا مقالہ جو کسی رسالے کی زینت بنا ہو، فاران کراچی میں شائع ہوا تھا۔ پھر جب جنوری ۱۹۶۱ء سے فروری ۱۹۶۴ء تک ماہنامہ ''ادیب'' علی گڑھ کے ادارتی عملے میں تھا تو میں نے بھی ان کے کئی مقالات شائع کرنے کا شرف حاصل کیا یہ شرف مجھے دوبارہ اس وقت حاصل ہوا جب میں نے ۱۹۷۳ء-۱۹۷۴ء میں کانفرنس گزٹ علی گڑھ کو ترتیب دینے کا کام انجام دیا۔ جون ۱۹۸۶ء سے ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے ادارتی عملے سے متعلق ہوں اسی مناسبت سے سہ بارہ یہ شرف پھر مجھ کو حاصل ہو گیا ہے کہ ان کے مقالات شائع کروں۔ شانِ خط مولانا اثری کے مقالات کی یہ ہوتی ہے (واضح رہے کہ وہ اصلاً خوش خط ہیں اور دوسروں کے مسودوں کو صاف کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، شبلی کالج اعظم گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں مجھے بھی اپنا ایک مسودہ ان سے صاف کروانے کی عزت حاصل ہے کہ کاتب تقدیر کے علاوہ دوسرا شخص ان کو پڑھنے میں بڑی دقت محسوس کرتا ہے۔ ستم بالائے ستم کاغذ کا کوئی کنارہ ایسا نہیں ہوتا جس پر تیر کا نشان بنا کر کچھ لکھ نہ دیا جائے۔ ۱۸۸۷ء کا آہنی قلم، بین السطور نام کو نہیں، بکھری ہوئی داستان کی طرح کاغذ

کے چاروں طرف بکھری ہوئی تحریر، جس کو کتابت کرتے وقت کاتب اپنے مقدر کو کوستا ضرور ہوگا، یہ ہوتا ہے مولانا اثری کا وہ مسودہ جو آب وتاب کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

یہاں پر ایک خاص واقعہ کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے انتقال کے بعد ارباب دارالمصنفین نے یہ طے کیا کہ دارالمصنفین کی طرف سے سید صاحب کی سوانح عمری شائع کی جائے اور اس کام کے لئے اس زمانے کے ناظم علمی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کا انتخاب ہوا۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب شاہ صاحب کے قلم کی روانی بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی اور وہ صرف معارف کے شذرات ہی لکھنے پر اکتفا فرماتے، جس کو وہ بڑے غور وفکر کے بعد لکھتے۔ جب حیات سلیمان کی اشاعت میں دیر ہونے لگی اور وقت خاصا گزر گیا تو مولانا ابوعلی اثری نے ''ایک عقیدت مند'' کی نقاب چہرے پر ڈالی اور ''میدانِ کارزار'' میں تن تنہا کود پڑے۔ پھر کیا تھا، صدق جدید لکھنؤ، فاران کراچی، قومی آواز لکھنؤ وغیرہ میں ''ایک عقیدت مند'' کے مراسلے شائع ہونے شروع ہو گئے جن میں یہ مطالبہ ہوتا کہ سید صاحب کی سوانح جلد شائع کی جائے۔ مراسلوں کی بھرمار سے شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم خاصے پریشان ہوئے۔ ان میں سے ایک مراسلہ تو ایسا تھا جس کا جواب شاہ صاحب کو ''معارف'' کے شذرات میں دینا پڑا جس میں انہوں نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا تھا کہ یہ عقیدت مند صاحب، خود ماشاءاللہ صاحب ذوق اور صاحب قلم ہیں اس لئے سیرت سلیمان لکھنے کے کسی سے کم اہل نہیں ہیں۔ بہرحال اس راز سے صرف دو اشخاص واقف تھے ایک یحییٰ اعظمی مرحوم، دوسرے راقم السطور۔ ایک دن ''عقیدت مند'' صاحب کے چہرے سے نقاب اس طرح اٹھی کہ ان کا کوئی مراسلہ کسی اخبار میں شائع ہوا۔ یحییٰ اعظمی مرحوم دفتر میں کام کرتے تھے اور مولانا اثری کتابخانے میں۔ یحییٰ اعظمی صاحب نے ایک رقعہ لکھ کر ان کو ان کے حسن تحریر پر مبارک دی، رقعہ انہوں نے پریس کے کسی ملازم سے بھجوایا تھا جو بجائے مولانا اثری کو رقعہ دینے کے، غلطی سے شاہ صاحب کو دے آیا۔ اس طرح برسوں کے بعد اس بات کا علم ہو سکا کہ یہ عقیدت مند تو دارالمصنفین کے کتابخانے

ہی میں روپوش ہیں۔ بہر حال مراسلات کی بھر مار سے گھبرا کر اس وقت تک شاہ صاحب اس موضوع پر کافی مواد جمع کر چکے تھے۔ اس راز کے فاش ہونے کے برس دو برس بعد ہی حیات سلیمان منظر عام پر آئی اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ اس کی اشاعت میں مولانا اثری کا بھی حصہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

سطور بالا میں تحریر کیا جا چکا ہے کہ مولانا اثری کو تصنیف وتالیف کی باقاعدہ تربیت حاصل نہیں اس بیان سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ دلکش، جاذب نظر، متوازن اور بامعنی تحریر پر دسترس نہیں رکھتے، امر واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اردو دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مقالہ نگار ہو جس نے باقاعدہ تصنیف وتالیف کی تربیت حاصل نہ کی ہو اور صرف اپنی مشقِ سخن اور ذوق وجذبہ کی بنا پر ''صاحب طرز'' بن گیا ہو۔ خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مولانا اثری ایک صاحب طرز ادیب ہیں، ان کے انداز تحریر کی نقل نہیں کی جا سکتی اور اگر ان کا تحریر کردہ ایک جملہ بھی کسی دوسری تحریر میں ملا دیا جائے تو وہ پکار پکار کر اس بات کا اعلان کرے گا کہ وہ کس کی تراوش قلم کا نتیجہ ہے؟ صاحب طرز ہونے کے لئے نہ تو باقاعدہ تصنیف وتالیف کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی موٹی موٹی کتابیں لکھنے کی، اگر ایسا ہوتا تو دار المصنفین کا ہر رفیق صاحب طرز ہوتا۔ ان مقالات کی اشاعت کے بعد آج نہیں تو کل جب اردو کے صاحب طرز ادیبوں پر کوئی مربوط اور مفصل کام ہوگا تو کوئی بھی ایماندار ناقد مولانا اثری کے طرز تحریر کو نظر انداز نہ کر سکے گا۔ وہ اپنے طرز کے موجد ہوں یا نہ ہوں خاتم ضرور ہیں اور اب ایسی تحریریں پیش کرنے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا جس کے یہاں شبلی اور ابوالکلام کا طرز تحریر اس انداز سے مخلوط ہو گیا ہو کہ ان کو جدا کرنا ناممکن ہو جائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ہمارے ان مظلوم رہنماؤں، ادیبوں اور دانش وروں میں ہیں جن کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوا اور ان کی زندگی میں ان کے عقیدت مندوں نے ان کو تمام غلطیوں سے مبرا اور کسی دوسری دنیا کی مخلوق کی حیثیت سے پیش کیا اور مخالفوں نے ان کی ایسی تخفیف کی کہ ان کو منہیات کا مرتکب ثابت کر کے چھوڑا۔ حالانکہ وہ

نہ تو غلطیوں سے مبرا انسان تھے نہ ہی منہیات کے مرتکب۔ ہاں وہ ایک ایسے انسان ضرور تھے جن کا ہاتھ ہمیشہ وقت کی نبض پر رہا اور انہوں نے اپنی خداداد فہم وفراست سے ان حوادث کا بھی صحیح صحیح اندازہ کرلیا جو آگے چل کر پیش آنے والے تھے ان کے بہت سے خدشے درست اور ان کی بہت سی پیش گوئیاں صحیح ثابت ہوئیں اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان کو کوئی مافوق الفطرت قوت حاصل تھی بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ اسباب وعلل کا معروضی تجزیہ کرنا جانتے تھے اور اس بات سے واقف تھے کہ کس عمل کا ردِّعمل کیا ہوگا؟ مولانا آزاد کی شخصیت کے بارے میں سب سے زیادہ خبث باطنی کا مظاہرہ پنڈت جواہر لال نہرو کے سکریٹری مسٹر متھائی نے اپنی انگریزی کتاب "My days with nehru" میں کیا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو یا انگریزی زبان میں کوئی ایسی تحریر اب تک معرضِ وجود میں نہیں آئی جو متھائی کے زہر کا ازالہ کرتی۔ مولانا آزاد کے انتقال کو تقریباً تیس برس کا عرصہ گزرنے کو آیا اب وقت آگیا ہے کہ ان کے بارے میں جو کچھ لکھا جاچکا ہے، اس کا ناقدانہ جائزہ لے کر اصل وحقیقی ابوالکلام آزاد کو نئی نسل سے روشناس کرایا جائے۔

ختم کلام کے طور پر مولانا ابوعلی اثری سے ایک نیازمندانہ گذارش ہے۔ انہوں نے سید صاحب کی بارگاہ میں عقیدت ومحبت کے پھول پیش کیے، مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت، ادبی بصارت اور علمی جاہ وجلال کو الفاظ کا خراج تحسین ادا کیا سبب ہے کہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے ایک دوسرے ممتاز شاگرد، سید صاحب کے خواجہ تاش، مولانا آزاد کے الہلالی دور کے رفیق وہم کار، مولانا شبلی کے مسلم ادبی جانشین مولانا عبدالسلامؒ ندوی ان کی نگاہ توجہ سے پرے رہ گئے ہیں، چونکہ ان کا آبائی اور پشتینی مسلک، مسلک اہل حدیث تھا اس لئے ان کے بہت سے فکری اجزا، دارالمصنفین کی معروف فکر سے میل نہ کھاتے۔ غالباً اسی وجہ سے ان کی سات کتابیں اب تک غیرمطبوعہ پڑی ہوئی ہیں۔ مولانا اثری ان کے اصل وحقیقی کارناموں کو ضبط تحریر میں لاکر بہت سے ان جالوں کو چھڑانے کا فریضہ انجام دے سکتے ہیں جو ان کے نام نہاد عقیدت مندوں نے ان کی شخصیت اور کارناموں کے گرد تان رکھے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ ضیاء اللہ کھوکھر صاحب، مولانا اثری سے مولانا عبدالسلام ندویؒ پر کتاب لکھوانے اور شایع کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

مولانا اثری کے زیر نظر مقالے مولانا آزاد کی جو تصویر کشی کرتے ہیں وہ دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ جاذب نظر بھی ہے امید ہے کہ اس مجموعہ مقالات کو ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔ اس کا ذوق وشوق سے پڑھنا ہی ایک پیر ہشتاد و پنج سالہ کی محنتوں کا صلہ ہوگا۔

کبیر احمد جائسی
۱۶/۴/۱۹۸۷ء

شعبہ مطالعات اسلامیہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

حرف آغاز

مولانا ابوالکلام کو تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہی اپنے والد سے شدید فکری اختلاف پیدا ہو گیا تھا، جو ان کے والد کے عتاب کا باعث بنا اور اسی کے نتیجہ میں انہوں نے کلکتہ چھوڑ دیا۔ بمبئی میں اتفاق سے ان کی ملاقات مولانا شبلی جیسے جینئس سے ہو گئی، مولانا پہلی ہی ملاقات میں ان کی غیر معمولی ذہانت اور دوسری خوبیوں سے متاثر ہو گئے ان کو اپنی تربیت میں لے لیا اور ندوہ میں اپنے ساتھ کچھ دنوں قیام کی ترغیب دی، جس کے لئے وہ راضی ہو گئے اور فوراً ہی ندوہ میں آ گئے۔ لکھنے پڑھنے کی صلاحیت ان میں پہلے سے تھی۔ رفتہ رفتہ مولانا کو ان کی اس صلاحیت پر اتنا اعتماد ہو گیا کہ ان کو رسالہ الندوہ کی مجلس ادارت میں شریک کر لیا۔ اور ان کو اس کا سب اڈیٹر بنا دیا۔ جو ان کے لئے بہت غیر معمولی بات تھی، لیکن ابھی چھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ الندوہ سے ان کی طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ اور ''وکیل'' امرتسر میں چلے گئے۔ وہیں انہوں نے عراق کے سفر کا منصوبہ بنایا اور اپنے بڑے بھائی غلام یٰسین آہ کو لے کر جو اتفاق سے وہیں موجود تھے، عراق کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ بغداد پہنچتے ہی ان کے بھائی بیمار ہو گئے اور وہ وہیں سے واپس چلے آئے۔ مولانا سفر سے واپس آئے تو بھائی کی علالت کا سلسلہ جاری تھا۔ اسی میں بالآخر ان کا انتقال ہو گیا۔ جس کا ان کے والد کو بے حد صدمہ ہوا، اور اسی صدمہ سے وہ بھی بیمار پڑ گئے۔ اولاد نرینہ میں صرف مولانا ابوالکلام باقی رہ گئے تھے۔ جن کو ان سے فکری اختلاف تھا اور وہ اپنے والد کے پیری مریدی کے طریقے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر بھی جب ان کے والد کی حالت نازک ہو گئی تو انہوں نے تار دے کر امرتسر سے کلکتہ بلایا اور

ان کو اپنا جانشین بنایا، اس کے بعد ان کا انتقال ہو گیا ان کے والد نے اپنے اس پیشہ کے ذریعہ بہت دولت اور کلکتہ و بمبئی وغیرہ میں بڑی جائداد اور املاک پیدا کر لی تھی۔ کئی مکانات تھے، وہ سب مولانا کو وراثت میں ملے۔ لیکن مولانا نے کوئی مستقل ذریعہ معاش نہ ہونے کی وجہ سے کلکتہ کے مسکونہ مکان کے علاوہ جو کڑ ابہ کی طرف صالح لین میں تھا، اور جس کی زیارت کا شرف خاکسار کو بھی حاصل ہے۔ رفتہ رفتہ ساری املاک و جائداد بیچ دی، مگر انہوں نے پیری مریدی کے طریقے کو ذریعہ معاش نہیں بنایا، جس کو وہ شرعاً صحیح نہیں سمجھتے تھے اور اسی پر وہ زندگی کے آخر تک پوری استقامت کے ساتھ قائم ہے۔ اس درمیان میں ان کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے مقروض بھی ہونا پڑا، پھر بھی انہوں نے دامنِ صبر ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اور کھانے پینے اوڑھنے اور زندگی کی دوسری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تکلیفیں اٹھاتے رہے اور اپنے والد کی زندگی میں انہوں نے اپنے لئے جو راہ عمل اختیار کی تھی، اسی پر پوری استقامت کے ساتھ زندگی بھر گامزن رہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ہر طرح کی مدد کی اور خوب خوب نوازا۔

آخر میں پنجاب کے مشہور اہلحدیث عالم اور رئیس مولانا عبدالقادر قصوری وکیل ان کے کفیل ہو گئے تھے۔ اور ان کے تمام اخراجات کی ذمہ داری لے لی تھی اور ان کو وہ اپنے لائق بیٹوں جناب محمد علی صاحب کینٹب اور جناب محی الدین صاحب کی طرح مانتے تھے۔ اور مولانا بھی ان کو ابا کہتے تھے اور ان کے صاحبزادوں کو اپنا بھائی سمجھتے تھے، جب تک مولانا عبدالقادر قصوری زندہ رہے۔ یہ انہی کے خاندان کے ساتھ رہے اور وہ مولانا کی تمام ضروریات پوری کرتے رہے، ان کے صاحبزادوں کو بھی ان سے بڑا اخلاص تھا۔

مولانا کو اپنے والد سے فکری اختلاف تو ضرور ہو گیا تھا، لیکن ان کی علمی جلالت سے انکار نہیں تھا اور انہوں نے جو علمی کارنامے انجام دیے ہیں، ان پر ان کو فخر بھی تھا۔ اس کا ذکر، انہوں نے بڑے لطف و لذت کے ساتھ اپنے مجموعہ خطوط ''کاروانِ خیال'' میں کیا ہے۔

بغداد کے سفر میں مولانا حضرت شیخ آلوسی زادہؒ سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ لکھا ہے کہ ''میں نے علوم عربیہ میں ان سے بڑھ کر کسی کو صاحب رسوخ واحاطہ نہیں پایا۔ ادب عربی کے حافظ بھی تھے اور ناقد بھی۔۔۔۔ ایام واشعار عرب کی پوری دنیا ان کے دماغ میں سمٹ آئی تھی۔ جس گوشے کو جب چاہتے تھے دیکھ لیتے۔'' انہوں نے عرب جاہلیت کی میسوط تاریخ تین جلدوں میں بلوغ الارب لکھی تھی۔ بلوغ الارب پہلے بغداد میں چھپی تھی، پھر مصر میں بھی چھپ گئی۔ ان ہی کے بھائی شیخ نعمان آلوسی زادہ تھے، انہوں نے ''جلاء العینین فی محاکمۃ الاحمدین'' لکھی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے مصر میں چھپوائی، ان کے والد شیخ شہاب الدین آلوسی مفتی بغداد کی تفسیر روح المعانی مشہور ہے۔''

لکھتے ہیں کہ

> ''ان کے خاندان سے میرے خاندان کا پہلا رشتہ کچھ عجیب طرح کے حالات میں قائم ہوا تھا، والد مرحوم جب ۱۲۹۳ھ میں عراق گئے تھے، تو سید عبدالرحمٰن نقیب مرحوم کے والد سید علیؒ سجادہ نشین تھے، انہی کے یہاں ٹھہرے، شیخ آلوسی کا انتقال ہو چکا تھا، مگر ان کی مصنفات کے قلمی نسخے سید کے خاندان میں متداول تھے۔ اور بڑی عزت واحترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سید مرحوم نے شیخ کی تفسیر روح المعانی بڑے فخر ومباہات کے ساتھ دکھائی کہ ہمارے شیخ کی تصنیف ہے۔ شیخ آلوسی اگرچہ بہ ظاہر شاہراہ عام سے الگ نہیں ہوئے تھے۔۔۔۔ مگر دراصل سلفی المذہب تھے اور تقلید کی بندشیں بہت کچھ ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ چنانچہ تفسیر میں کہیں کہیں اس کی جھلک صاف نظر آ جاتی ہے، والد مرحوم حنفیت اور اشعریت میں بڑے ہی شدید تھے۔۔۔۔ ایک دن عین مجلس دیوان میں کہ شیخ نعمان آلوسی زادہ بھی موجود تھے، سید علی مرحوم نے پوچھا ''آپ نے شیخ کی تفسیر کو کیسا پایا؟ والد مرحوم نے بلا

تامل کیا خوب ہے، مگر کہیں کہیں وہابیت اور اعتزال کی بو مجھے محسوس
ہوئی'' یہ بے پردہ ایراد تمام مجلس پہ گراں گزرا، شیخ آلوسی نے حیات
خضر سے انکار کیا ہے۔ والد مرحوم نے سب سے پہلے اس کا تعاقب
کیا، پھر تفسیر کے تمام ایسے مقامات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے اور
ایک رسالہ تعقبات میں تصنیف کر کے شیخ نعمان کو بھیجا، شیخ نے اس
کے جواب میں ایک مکتوب لکھا۔ والد مرحوم نے جواب لکھ کر اس
مکتوب کو بھی مع اپنے جواب کے رسالہ کے آخر میں شامل کر دیا۔''

مجھ کو وہ طاق بھی دکھایا گیا، جہاں والد مرحوم بیٹھ کر لکھا پڑھا کرتے تھے اور وہ جگہ بھی دکھائی گئی جہاں والدہ مرحومہ ٹھیری تھیں۔ والد مرحوم کو لکھا ہوا اصل رسالہ بھی روح المعانی کے قلمی نسخہ کے ساتھ کتب خانہ میں موجود تھا۔

سید عبدالرحمٰن نقیب نے پہلی ہی ملاقات میں اپنی فراست سے سمجھ لیا تھا کہ میرے خیالات کی رفتار دوسری ہے، مجھے دوسرے دن شیخ سے ملایا، اور تعارف ان الفاظ میں کرایا، کہ تمہیں شیخ خیر الدین ہندی تو یاد ہوں گے۔ جنہوں نے شیخ آلوسی کی تفسیر پر تعقبات کیے تھے، یہ ان ہی کے فرزند ارجمند ہیں۔ بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ ملے، معانقہ کیا، پیشانی چومی۔ میں نے حجاز کے آداب کے مطابق ان کے گھٹنوں کو بوسہ دینا چاہا تو فوراً گھٹنے ہٹا لیے، اس کش مکش میں میرا سر تو ان کے گھٹنوں تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن میری پگڑی ان کے قدموں پر گر گئی اور مجھے اس وقت بے اختیار حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد آ گیا

اے خوش آں عاشق سرمست کہ بر پائے حبیب
سر و دستار نداند کہ کدام انداز د!

سفر بغداد کے اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عقیدہ و فکر کے شدید اختلاف کے باوجود ان کے دل میں اپنے والد کا کتنا احترام تھا، اور ان کو کس احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے تھے، اور اپنے والد کے سفر عراق کے اس واقعہ کو کس والہانہ انداز سے بیان کیا، مگر شیوخ بغداد کی فراست کی بھی داد دینی چاہی کہ انہوں نے مولانا کی گفتگو سے یہ سمجھ

لیا کہ ان کے خیالات کی رفتار ان کے والد سے مختلف ہے اس کا احساس ہونے کے بعد انہوں نے مولانا کا جو اکرام واعزاز کیا ہوگا وہ ظاہر ہے۔

مولانا کے والد کو اپنے عقائد میں جو صلابت اور شدت تھی، اس کو مولانا نے جیسا کہ ابھی آپ نے اوپر کی سطروں میں پڑھا ہے، بہت ہلکے الفاظ سے تعبیر کیا ہے، یعنی یہ کہ والد مرحوم حنفیت و اشعریت میں بڑے شدید تھے، حقیقت یہ ہے کہ بریلویوں کے مشہور روزگار امام مولانا احمد رضا خاں بریلوی سے کہیں زیادہ اپنے عقائد میں سخت تھے، وہ مشکل ہی سے کسی کو مسلمان سمجھنے کے لئے تیار ہوتے تھے، جو بھی ان کے مسلک اور عقائد سے اختلاف رکھتا تھا، وہ اس کو علانیہ کافر سمجھتے تھے، شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ اور ان کے ماننے والوں کو اور ہندوستان میں اہل حدیث کے سخت مخالف تھے، ایسا ہی اپنے صاحبزادے مولانا ابوالکلام کو بھی بنانا چاہتے تھے، انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے سامنے ایسے بزرگوں کو پایا جو عقائد وافکار میں اپنے ایک خاص مزاج رکھتے تھے اور اس میں اس درجہ متصلب اور بے لچک تھے، کہ بال برابر بھی ادھر ادھر ہونا کفر و زندقہ تصور کرتے تھے، انہوں نے بچپن میں جو روایتیں سنیں اور وہ سرتا سر اس رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور ان کا دماغی ورثہ اس تعصب اور جمود سے بوجھل تھا، تعلیم ایسے گردوش میں ہوئی، جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری سے گھرا ہوا تھا، باہر کی مخالف ہوا کا وہاں تک گزر بھی نہیں ہوسکتا تھا، اپنے والد مرحوم کے علاوہ گھر کی چار دیواری کے اندر جن اساتذہ سے بھی تعلیم کا اتفاق ہوا، وہ بھی وہی تھے، جن کو اُن کے والد مرحوم نے پہلے سے اچھی طرح ٹھونک بجا کے دیکھ لیا تھا، کہ اُن کے معیار عقاید وافکار پر پورے اُترتے ہیں یا نہیں اور یہ معیار اس درجہ تنگ اور سخت تھا کہ معاصروں میں خال خال اشخاص ہی کی وہاں تک رسائی ہوسکتی تھی۔

انگریزی تعلیم دلانے کا ان کے والد کو کبھی وہم بھی نہیں پیدا ہوا، قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسہ میں بھی ان کو بآسانی بھیجا جاسکتا تھا، لیکن ان کے والد مرحوم کو یہ بھی گوارا نہیں تھا، مدرسہ عالیہ کی تو ان کی نگاہ میں کوئی وقعت ہی نہیں تھی، اور کلکتہ سے باہر

ان کو بھیجنا تو بالکل گوارا نہ تھا کہ کہیں باہر کے لوگوں کی صحبت سے ان کے عقائد خراب نہ ہو جائیں ۔اور پھر آئندہ ان کے کام کے نہ رہیں ،اس خیال سے شروع سے آخر تک پوری عربی تعلیم گھر کی چہار دیواری کے اندر ہی ہوئی ،اور یہیں سے انھوں نے تعلیم سے فراغت بھی حاصل کر لی ،لیکن ان تمام احتیاطوں ، پابندیوں ،بندشوں ،رکاوٹوں اور موانع کے باوجود جواُن کے والد نے ان کی تعلیم کے سلسلہ میں قائم رکھے تھے اوران کے عقائد کا تعصب وتصلب کوئی روک نہ بن سکا اور خدائے مقلب القلوب نے ان کے دل میں ان کے والد کے عقائد وافکار کی طرف سے سخت نفرت پیدا کر دی اور وہ اپنے والد کے مشرب ومسلک سے ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے ،جس کا علم ہوتے ہی ،ان کے والد نے ان کو گھر سے نکال دیا ،اور پھر وہ اپنے والد کے قریب نہیں گئے ،جب وہ اپنے بڑے لڑکے غلام یٰسین آہ کی وفات کے غم میں بیمار پڑ گئے ،اور حالت نازک ہو گئی ،تو چونکہ اولاد نرینہ میں کوئی اور نہیں تھا ،اس لیے ان کو تار دے کر امرتسر سے کلکتہ بلایا ،اوران کو اپنا جانشین ،اور اپنی تمام املاک وجائداد کا تنہا وارث بنایا لیکن مولانا نے اس کے باوجود بھی اپنے والد کی زندگی میں اپنے لیے جو راہ طے کر لی تھی ،اُس کو نہیں چھوڑا ،زندگی بھر اُسی پر گامزن رہے ، یہ اللہ تعالےٰ کا اُن پر بڑا فضل وکرم تھا۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

مولانا ابوالکلام آزاد

اور

مصنف

مولانا ابوالکلام آزاد
اور
خاکسار

مجھے کلکتہ کے مختلف سفروں میں ہندوستان کی قومی و ملی سیاسی زندگی کے جن مشاہیر رجال کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، ان میں ایک مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے، جن کے دیکھنے اور ان کی زبان شیوہ بیان سے ان کی تقریر سننے کا مجھے آغاز شعور ہی سے بڑا اشتیاق تھا، الحمدللہ کہ میں نے ان کو مختلف تقریبوں میں بہت قریب سے بھی دیکھا اور مختلف جلسوں میں ان کی تقریریں بھی سنیں، اور میں نے ان کو اپنے تصور وخیال سے کہیں زیادہ ہر اعتبار سے بہت بلند پایا، مولانا اس کے بعد کم وبیش ۳۵ سال زندہ رہے، لیکن میں نہ پھر کبھی اپنے شہر سے نکلا، نہ مولانا کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس عرصہ میں جتنی بھی قومی و ملی و سیاسی تحریکیں ملک میں اٹھیں، میں ان سب میں ان کا ہم نوا اور پر جوش نقیب رہا، نہرو رپورٹ کا اتنا حامی تھا کہ ۱۹۲۸ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں جو پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، خاص طور سے شریک ہوا تھا۔ اس میں مسلمانوں کے سواد اعظم کے علی الرغم، اس نہرو رپورٹ کی توثیق کی گئی، اور گورنمنٹ برطانیہ سے اس کی منظوری کے لئے ایک سال کی مدت مقرر کی گئی، کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں آل پارٹیز کنونشن بھی تھا، جس کے لئے الگ سے پنڈال بنایا گیا تھا، اس میں ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈر شریک تھے، اسی میں پہلی مرتبہ میں نے قائداعظم محمد علی جناح کو بھی دیکھا، جو اس وقت تک قائداعظم نہیں

ہوئے تھے، ان کی انگریزی تقریر مجمع نے بڑے سکون اور دلچسپی کے ساتھ سنی، مگر ان کو بھی نہرو رپورٹ سے کچھ زیادہ اتفاق نہیں تھا، انہوں نے وہاں بھی مسلم حقوق کے لئے اپنے تیرہ نکات پیش کیے۔ ہندوستان کی ہر پارٹی کے بڑے بڑے لیڈر جن کو ملک گیر اور بعض بعض کو عالمگیر شہرت حاصل تھی، اسٹیج پر رونق افروز تھے، اسٹیج کے نیچے کی نشست کی ایک قطار میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی سر پر سیاہ کلپاخ، گلے میں سفید کھدر کی شیروانی، پیروں میں نہایت خوبصورت سفید ناگرا جوتا پہنے اور سفید کھدر کی چادر کاندھوں پر ڈالے ہوئے نہایت تمکنت اور وقار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، مگر انہوں نے شروع سے آخر تک کنونشن کی کاروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا، مجمع کی طرف روخ کیے ہوئے آخر تک خاموش بیٹھے رہے، یہ کنونشن تو درحقیقت اسی نہرو رپورٹ کی توثیق کے لئے منعقد ہوا تھا، اور اس سے بھی متفقہ طور پر اس کی توثیق کرائی گئی، لیکن اس میں نہرو رپورٹ کے ناقدین و معترضین ومخاطبین میں سے سوائے محمد علی جوہر اور مسٹر جناح کے کسی کو اظہار خیال کا موقع نہیں دیا گیا۔

صدر کانگریس پنڈت موتی لال نہرو، اور نہرو رپورٹ کے بڑے بڑے مسلمان مؤیدین جن میں ایک مولانا مسعود علی ندوی بھی تھے، وہ جہاں ٹھہرے ہوئے تھے، میں ہر روز مولانا مسعود علی کی ملاقات کے لئے وہاں برابر جاتا تھا، ایک روز تو آل پارٹیز کنونشن کے صدر ڈاکٹر انصاری کے ساتھ جانے کی سعادت حاصل ہوئی، اس مجلس میں بمبئی کرانیکل کے مشہور روزگار ایڈیٹر عبداللہ بریلوی، عارف ھسوی اور کئی ایک اور لیڈر بھی تھے، ڈاکٹر انصاری کا زیادہ تخاطب، مسٹر عبداللہ بریلوی کی طرف تھا، اور وہ دونوں انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے، ایک مرتبہ مولانا مسعود علی کی خدمت کے لئے وہیں موجود تھا، تو مولانا آزاد اپنے کسی معزز دوست کے ساتھ اس کوٹھی میں ٹھہرے ہوئے تمام مہمانوں کی پرسش احوال کے لئے تشریف لائے، اور اپنے دوست سے مولانا مسعود علی کا ان الفاظ میں تعارف کرایا کہ یہ مولانا مسعود علی ندوی ہیں، جنھوں نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین قائم کیا ہے، کپڑے کی صنعت کے لحاظ سے جس طرح مئو اور مبارک پور کو تمام ملک میں شہرت حاصل ہے، اسی طرح اعظم گڑھ کو حاصل ہے، اس ذو معنی تعارف سے

سب لوگ بہت محظوظ ہوئے۔ اس وقت علمی انسٹی ٹیوٹ ہال کلکتہ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس جناح صاحب کی صدارت میں ہوا تھا، مولانا نے مولانا مسعود علی سے فرمایا کہ آپ لوگ بھی اس جلسہ میں شرکت کیجیے، دیکھیے جناح صاحب کیا کہتے ہیں۔

اس کے بعد یا پہلے جب جب بھی میں نے ان کو قریب سے دیکھا، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے، پہلے ان کی وزارتی زندگی کا ایک واقعہ سن لیجیے، جس کے راوی ان کے پرائیویٹ سیکرٹری اجمل خاں ہیں اور اس کو ان ہی نے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایڈیٹر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ سے بیان کیا، فرمایا پنڈت جواہر لعل نہرو وزیر اعظم کی حیثیت سے بیرونی ملکوں کے سفر پر جاتے تھے، یا واپس آئے تھے، تو قاعدہ کے مطابق وزراء اور سفراء ہوائی اڈے پر ضرور موجود ہوتے تھے، ایک مرتبہ پنڈت جی کسی بیرونی ملک کے طویل سفر سے واپس آئے، تو حسب معمول اور وزراء کے ساتھ مولانا بھی ہوائی اڈے پر گئے اور بغیر ملاقات کے واپس چلے آئے، پنڈت جی کو خود ہی دو روز کے بعد خیال ہوا، کہ وہ مولانا سے مل کر اپنے سفر کی روداد بیان نہ کر سکے، انھوں نے پروفیسر اجمل خاں کو ٹیلیفون کیا کہ مولانا خالی ہوں تو وہ آجائیں، وقت ساڑھے بارہ بجے کا تھا، اجمل صاحب نے مولانا کو اطلاع دی، تو فرمایا کہ کہہ دو یہ کون سا وقت ملنے کا ہے، اجمل صاحب کو مولانا کا یہ جواب پنڈت جی تک پہنچانے کی ہمت نہیں پڑی، تو انھوں نے یہ بات بنائی کہ مولانا کو آپ کی تشریف آوری کی اطلاع دینے گیا تھا، تو وہ سو رہے تھے، آپ فرمائیں تو ان کو جگا کر آپ کا پیام پہنچا دوں، پنڈت جی نے فرمایا کہ ان کو جگانے کی تکلیف نہ دیں!

مولانا کے یہاں باریابی پہلے بھی، جبکہ وہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد تھے، بہت مشکل سے ہوتی تھی اور مجھے تو بدقسمتی سے سرے سے باریابی کی عزت حاصل ہی نہیں ہوئی، جس کی تمنا لے کر اُن کے دانش کدۂ علم وکمال پر حاضر ہوا تھا، مولانا ابوالحسنات ندوی رفیق دارالمصنفین اپنے مزمن مرض عرق النساء کے علاج کے لیے کلکتہ تشریف لے گئے تھے، اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سفارش سے میرے ایک بہت ہی قریبی عزیز وبزرگ کے یہاں ٹھہرے تھے، میں بھی اُس وقت اُن کے یہاں موجود تھا، جہاں مجھ کو بھی

اس بیماری میں ان کی تیمارداری اور خدمت کا موقع ملا، ان کا ایک زمانہ میں دفتر الہلال کلکتہ سے تعلق تھا، اور مولانا ابوالکلام سے کافی جان پہچان تھی، انھوں نے مجھ کو ایک دستی خط لکھ کر دیا کہ اس کو مولانا کے یہاں پہنچا دو، میں مولانا کے گھر کا جو تصور لے کر گیا تھا، اُس سے میں نے بہت مختلف پایا، بہت ہی معمولی مکان تھا، سامنے ایک دیوار سے گھرا ہوا چھوٹا صحن تھا اس کے بعد برآمدہ تھا، جس میں سڑی گلی ایک لمبی بنچ بچھی ہوئی تھی، جو لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے تھے، اسی پر بیٹھ کر باریابی کا انتظار کرتے تھے، میں بھی اُس پر بیٹھ گیا۔ اُسی سے بالکل ملا ہوا، ایک زمین دوز طویل کمرہ تھا، اُسی میں البلاغ پریس تھا، جب میں اس بنچ پر بیٹھا انتظار کرتے کرتے تھک گیا اور باریابی سے مایوس ہو گیا، تو میں اٹھ کر اسی زمین دوز کمرہ کے اندر گیا، پریس بند تھا، اور کرسی پر دو آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے ایک غالباً فضل الدین احمد صاحب تھے، جو پنجاب کے رہنے والے البلاغ پریس کے منیجر اور مولانا کی مشہور کتاب تذکرہ کے طابع و ناشر تھے اور جن کے اصرار سے مولانا نے یہ تذکرہ لکھا تھا، اور دوسرے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی تھے، جن کو میں دیکھتے ہی پہچان گیا، ان کو اس سے پہلے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں دیکھا تھا، جہاں وہ سید رشید رضا صاحب المنار کے مدرسہ الدعوۃ والارشاد مصر سے فارغ ہو کر اپنے مربی اور استاد مولانا شبلی متکلم ندوی مہتمم مدرسہ اور اپنے ندوی دوست مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی سے ملنے آئے تھے، انھوں نے ہمارے درجہ کے عربی ادب کا امتحان بھی لیا تھا، دوسری مرتبہ کلکتہ ہی میں خلافت کانفرنس کے دن کے اجلاس میں، جو کانگرس کے اسپیشل اجلاس کے دیودار کی لکڑی کے عظیم الشان پنڈال میں منعقد ہوا تھا، جن پر میری نگاہ اجلاس کے ختم ہونے کے بعد پڑی، لیکن مدرسۃ الاصلاح کے ایک ادبی طالب علم اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کے سب سے کم مایہ شاگرد کی حیثیت سے ان سے نہیں ملا، نہ اس وقت اس کا موقع ہی تھا، میں نے مولانا ملیح آبادی سے عرض کیا، کہ مولانا کے نام مولانا ابوالحسنات صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین کا خط لایا ہوں، بہت دیر سے مولانا کی خدمت میں باریابی کی اجازت کا منتظر ہوں، معلوم نہیں کب مجھ ناچیز کی باری آئے، اور رات بھی ہو گئی ہے، میں ایڈن ہاسپٹل روڈ سے جو یہاں سے کافی

فاصلہ پر ہے آیا ہوں، انہوں نے مجھ سے کچھ دریافت کیے بغیر ازراہ شفقت میرے ہاتھ سے خط لے لیا کہ میں ابھی ان کی خدمت میں پہنچا دیتا ہوں، تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد ایک آدمی میرے پاس آیا، کہا کہ مولانا کو خط مل گیا ہے، اب آپ جا سکتے ہیں، اور میں ہمہ تن حرمان بن کر یہ شعر پڑھتا ہوا واپس چلا آیا۔

ہمہ شوق آمدہ دم ہمہ حرماں رفتم

لیکن اس آستانہ علم و دانش پر میری یہ آمد، مولانا کی غیر متوقع زیارت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ دوسرے دن بالکل علی الصباح جبکہ ہم اپنی روزانہ کی ضروریات سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے، کہ مولانا ابوالحسنات کی عیادت کے لئے ہمارے گھر پہنچ گئے، ہم نے جی بھر کے ان کی زیارت بھی کی، اور شہد و شکر سے بھی کہیں زیادہ شریں باتیں ان کی زبان کے شیوہ بیان سے سنیں، یہیں محدث جلیل حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کے نواسے، لکھنو کے مشہور ترین ماہر امراض چشم ڈاکٹر عبدالرحیم کے صاحبزادے اور ہمارے عزیز کے منجھلے داماد مصطفٰے انصاری صاحب سے بھی مولانا کی ملاقات ہوئی، ان کو جب حافظ عبداللہ غازی پوری سے ان کی نسبت کا علم ہوا، تو بڑی حسرت کا اظہار فرمایا اور ان سے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور محدث جلیل سے اپنے عقیدت مندانہ تعلق کا اظہار فرمایا۔ جب مولانا ابوالحسنات سے رخصت ہو کر واپس جانے لگے تو فرمایا کہ کوئی ضرورت ہو تو مجھے یاد کیجیے گا، ہم سب نے گاڑی تک ان کی مشایعت کی، یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے، جب مولانا کی شہرت اور مقبولیت کا انتہائی عروج تھا اور سارا کلکتہ ان کی پرستش کرتا تھا، اور ان کی آواز پر اٹھتا بیٹھتا تھا۔

ایک مرتبہ مسجد ناخدا میں بہت قریب سے ان کی اور مولانا محمد علی دونوں بزرگوں کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی، جمعہ کا دن تھا، جمعہ کی نماز سے پہلے اعلان ہوا، کہ نماز جمعہ کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی مسئلہ خلافت پر تقریر کریں گے، نماز سے فارغ ہو کر دونوں بزرگ مسجد کے برآمدے کے بیچ کے در میں آکر پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے اور مجھے حسن اتفاق سے بالکل ان کے قریب ہی صحن میں جگہ مل گئی، تقریر کیا تھی، قرآن کی آیات اور احادیث سے لبریز پورا وعظ تھا، بہت پر درد، مؤثر اور رقت انگیز، مولانا محمد علی

تقریر کر کے پھر اسی در میں بیٹھ گئے، اور مولانا ابوالکلام سے عرض کیا، کہ مسجد کے ایک دروازہ پر آ کر کھڑے ہو جائیں اور ایک دروازہ پر میں، اور خلافت فنڈ کے لئے لوگوں سے چندہ وصول کر لیا جائے، لیکن مولانا اس کے لئے تیار نہیں ہوئے، اور بیٹھے ہی بیٹھے دونوں صاحبوں نے باری باری چندے کی اپیل کی، ابھی اپیل ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے اپنی جیب سے چار روپیہ نکال کر جو میں نے انہی مولانا ابوالحسنات ندوی سے نئے کپڑے بنوانے کے لئے قرض لئے تھے، مولانا محمد علی کے ہاتھ میں دے دیے۔

ایک مرتبہ اور اسی مسجد ناخدا میں بہت قریب سے دیکھا، جمعہ کا دن تھا، نماز کے بعد وہ تقریر سے فارغ ہو کر صحن سے گزر رہے تھے، کہ ایک عقیدت مند فرطِ عقیدت سے ان کا قدم چومنے کے لئے جھکا، اس غریب کو یہ کہتے ہوئے اس زور سے ٹھوکر دی کہ یہ ناجائز ہے، حرام ہے۔ وہ تلملا اٹھا، باہر پھاٹک پر آئے، تو پھر لوگوں کا ہجوم ان کے احترام کے لئے آگے بڑھا، اس وقت بھی یہ فرماتے ہوئے، کہ یہ ناجائز ہے اور گاڑی پر بیٹھ کر فوراً روانہ ہو گئے، اسی مسجد ناخدا میں ان کے والد، مولانا خیرالدین امام تھے اور جس نے ۵ زکریا اسٹریٹ میں یہ عظیم الشان مسجد تعمیر کرائی تھی وہ مسلمان تھا اور انہی کا مرید تھا، مولانا جب کلکتہ میں رہتے تھے، تو اپنے گھر صالح لین سے جمعہ پڑھنے کے لئے اسی مسجد میں آتے تھے اور اکثر جمعہ کے بعد وعظ بھی فرماتے تھے، ایک مرتبہ رات میں بعد نماز عشاء جلسہ ہوا، مولانا نے مسلمانوں میں غیرت پیدا کرنے کے لئے، پنڈت مدن موہن مالویہ کی مثال دی کہ دیکھو اپنی قوم کے لئے کیسا کر رہا ہے، میں چاہتا ہوں، انہی کی طرح ہر مسلمان اپنی قوم کے لئے سراپا عمل بن جائے اور قوم کی خدمت کرے۔

وہ ہندو لیڈروں میں جمنا لال بجاج سے بہت متاثر تھے، گاندھی جی کے لئے وردھا میں آشرم انہی نے بنوایا ہوا تھا اور آشرم اور گاندھی جی کے تنہا یہی کفیل تھے، اور پھر وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے خزانچی بھی تھے، وہ کلکتہ آئے، ان کے آنے میں محمد علی پارک میں جلسہ ہوا، جس میں انہوں نے جمنا لال بجاج کو بہت شاندار الفاظ میں ملک کے لئے ان کی بے پناہ مالی قربانیوں کے لئے خراج تحسین پیش کیا، میں اس جلسہ میں موجود تھا۔

امام الہند

مولانا ابوالکلام آزاد

ابوالکلام پالٹیشین ہی نہیں، ایک جماعت قومی کا صدر ہی نہیں، ایک بے پناہ قائد ہی نہیں، بین الاقوامی شہرت کا مالک ہی نہیں، ایثار و قربانی کی ایک مجسم مثال ہی نہیں، ہندوستان کا یوسف زندانی ہی نہیں، اگرچہ یہ چیزیں بھی کچھ کم قابل فخر نہیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ آج کل کی قومی زندگی کی معراج ہیں، لیکن وہ ان سب سے مافوق علم و ادب کا امام ہے، قرآن کے علوم و معارف کا راز دان ہے، فقہ و حدیث کا نکتہ شناس ہے، علوم قدیمہ و جدیدہ کا مجمع البحرین ہے، اور اس کی یہ جو حیثیت اس کی تمام مختلف النوع حیثیتوں پر مقدم ہے، بلکہ سچ پوچھیے تو دنیا نے ایک عالم، ایک مصلح، ایک مجدد، ایک ریفارمر، ایک داعی الی الخیر ہی کی حیثیت سے پہلے اس کو جانا اور پہچانا بھی اور اس کی اس حیثیت پر آج تک کسی کو شک نہیں ہوا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس کی علمی عظمتوں اور دینی فہم و فراست کا قائل ہے

الفضل ما شهدت به الاعداء

تعمق فی الدین، تمسک بالکتاب، توغل فی المذہب کا ذوق مسلمانوں میں اسی نے پیدا کیا، ملک میں آج جہاں بھی کچھ بیداری اور مذہبی سرگرمی نظر آ رہی ہے اور قرآن سے شغف بڑھ رہا ہے۔ اسی کی اولین مجددانہ کوششوں کا فیض ہے۔

علم و ادب و سیاست میں وہ صحیح معنی میں عبقری وقت ہے۔ اس ہستی یگانہ، اس

فرد فرید، اس واحد ذات کے ادب میں جو خوبی ولطافت و بلندی ہے وہ موجودہ عہد کے کسی ادیب اور مصنف کے سرمایہ نگارش میں نہیں، اس کے قلم نے شبلی کی بلندی، حالی کی سادگی، آزاد کی رنگینی اور نذیر احمد کا بانکپن بیک وقت جمع کر لیا، اس لحاظ سے وہ اردو کے عناصر خمسہ کا تنہا قائم مقام تھا۔

الہلال ایک ادبی صحیفہ ہی نہیں، اپنے دور کی تمام ملی وقومی وسیاسی وبین الاقوامی تحریکوں کی انسائیکلو پیڈیا ہے، جس سے بہتر آج تک لٹریچر پیدا نہ ہو سکا، مولانا ابوالکلام کچھ بھی نہ ہوتے، تو الہلال کی یہ جلدیں جو ارباب ادب کی الماریوں اور میزوں کی زینت ہیں، ان کی عظمت کے ثبوت کے لئے کافی تھیں، اور یہ کہا جا سکتا ہے، کہ

نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

مسلمانوں کے عواطف و جذبات، افکار و خیالات کا ترجمان اور مسلمانوں کی تہذیب و تاریخ و روایات کا واقف کار مولانا ابوالکلام سے بڑھ کو دوسرا کون تھا، ان کی ذات پر مسلمانوں نے جتنا اعتماد کیا، کسی مسلمان لیڈر پر نہیں کیا، انھوں نے جو دعوت دی، اس پر لبیک کہا، جو تحریک پیش کی، اس کا خیر مقدم کیا۔ جو راستہ دکھایا، اسے صراط مستقیم سمجھا، ملی زندگی کا جو پروگرام بنایا، اس پر عمل کیا، ترکوں کی امداد کی اپیل کی اور چشم زدن میں ان کے قدموں پر روپیوں کا ڈھیر لگ گیا، غزوۂ بلقان کے زخمی ترکوں کی تیمارداری و طبی اعانت کی تجویز پیش کی اوران کی خدمت اور خونچکاں زخموں کی بخیہ گری کے لئے ایک طبی مشن فوراً ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ہندوستان سے روانہ ہو گیا۔ کانپور مچھلی بازار کی مسجد شہید کی گئی اور مسلمانوں نے اس کے احترام میں اپنی جانیں فدا کر دیں تو تنہا انہی کی آواز پر سارا ہندوستان ان کی حمایت پر آمادہ ہو گیا، لکھنؤ میں مسلم یونیورسٹی کی فاونڈیشن کمیٹی کا جلسہ ہوا، اور احرار کسی کے غمزۂ جانستان کا شکار ہو گئے، تو مولانا ہی کی پکار پر ہندوستان کے سارے مسلمان ان کے گرد جمع ہو گئے، غرضیکہ ان سب تحریکوں کے رہنما وہی تھے اور قیادت عامہ کی باگ انہی کے مضبوط ہاتھوں میں ہوتی تھی، اعضاد و جوارح کا کام دوسرے کرتے تھے۔ لیکن عقل و دماغ انہی کا کام کرتا تھا۔

جس تحریک کی تائید میں اپنے قلم جادو رقم سے دو چار حرف لکھ دیتے تھے، وہ ہندوستان گیر ہو جاتی تھی، اور ملک کے طول وعرض میں پھیل جاتی تھی، الہلال کا ایک ایک لفظ لعل وگوہر سے تولا جاتا تھا، اور وہ جو حکم دیتا تھا، وہ وحی منزل ہو جاتا، جس کی تعمیل فرض اور واجب ہو جاتی تھی، موجودہ تحریک آزادی کے وہ ان رہنماؤں میں سے ہیں جو کامل استقلال کے ساتھ ہر نشیب وفراز سے گزر کر آگے بڑھتے رہے۔

مچھلی بازار کانپور کی مسجد کی تحریک کے لیے اس زور سے صور پھونکا، تمام ہندوستان آتش زیر پا ہو گیا اور مسلمان اس کے لیے مرنے اور مارنے پر تیار ہو گئے، خلافت تحریک کی کامیابی تمام ترانہی کے مساعی کی رہین منت ہے۔ انھوں نے اس کا جھنڈا اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان عقیدہ وخیال اور مذہب ومسلک کے سارے اختلافات بھلا کر اس کے نیچے آگئے۔ حکومت سے ترک موالات وعدم تعاون کا فتوے دیا تو لاتعداد مسلمانوں نے سرکاری ملازمتیں چھوڑ دیں۔ یہ ان کی زندگی کے وہ واقعات ہیں، جن کو تاریخ فراموش نہیں کرسکتی، ان کی یہی قومی وملی اور دینی وسیاسی خدمات تھیں کہ مسلمانوں نے ان کو امام الہند کا خطاب دیا، جو ان کے شاندار اور فقید المثال نام کا جزو لاینفک ہو گیا آج تک دنیا ان کو اسی نام سے پکارتی اور یاد کرتی ہے۔

(مکتوبہ ۱۹۴۶ء)

مولانا آزاد کی یاد

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

میں ابھی مدرسۃ الاصلاح سرائے میں متوسطات سے گزر کر اونچے درجے کی عربی کتابیں پڑھ رہا تھا اور صحاح میں مسلم شریف درس میں تھی، کہ پہلی پنج سالہ جنگ کے عالمگیر انفلوئنزا بخار میں میرے والد کا انتقال ہو گیا اور میری عربی تعلیم جس کو میرے والد نے بڑے ولولہ سے شروع کرایا تھا، خطرے میں آ گئی۔ کچھ دنوں تک تو میرے چچاؤں نے میری کفالت کی۔ اس کے بعد انہوں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور مجبوراً مجھے انہی کے مشورہ سے تلاش روزگار میں اپنی تعلیم نامکمل چھوڑ کر کلکتہ جانا پڑا۔ وہاں میں جن روحانی و دماغی اذیتوں، کلفتوں اور پریشانیوں میں مبتلا ہوا۔ اور جن واقعات، حوادث اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی یاد اتنی تلخ ہے کہ جب کوئی میرے سامنے کلکتہ کا ذکر کرتا ہے تو میں بے اختیار حضرت غالب کا یہ شعر پڑھ دیتا ہوں:

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے

حضرت غالب نے بھی اپنی زندگی میں ایک مرتبہ کلکتہ کا سفر کیا تھا اور ان کو بھی وہاں کے زمانہ قیام میں اسی طرح کے حالات و واقعات و حوادث پیش آئے تھے۔ اس لئے جب بھی کوئی ان کے سامنے کلکتہ کا نام لیتا تھا۔ تو اس کا پورا منظر ان کی نگاہوں کے سامنے کھینچ جاتا تھا اور بے چین ہو جاتے تھے، لیکن میرے سفر کلکتہ کی کچھ یادیں بہت ہی

خوشگوار اور نشاط انگیز ہیں۔ انہی میں ایک مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد بھی ہے۔ جو میری زندگی سے اس قدر وابستہ ہے کہ کبھی جیتے جی بھول نہیں سکتا۔ آج میں اسی کا ایک شمہ پیش کر رہا ہوں۔

داستان عہد گل را از نظیری می شنو
عندلیب آشفتہ تر گفت است ایں افسانہ را

میں نے پہلے پہل مولانا ابوالکلام کا نام اپنی مکتبی تعلیم کے زمانہ میں سنا۔ میں اپنے شہر اعظم گڑھ کے مدرسہ اسلامیہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سلسلہ اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا کہ مدرسہ کے سینئر طلبہ نے مذاکرۂ علمیہ کے نام سے ایک ادبی مجلس قائم کی۔ جس کا مقصد تقریر وتحریر کی مشق تھی۔ اس کے جلسے ہفتہ وار ہوتے تھے۔ کچھ لوگ تقریر کرتے تھے اور کچھ لوگ مضمون لکھ کر سناتے تھے۔ اس کا ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی تھا۔ جس میں وقت کے متعدد بلند پایہ اور مشہور اخبارات ورسائل آتے تھے، ان میں سے چار کے نام اب تک یاد ہیں، انشاء اللہ خاں کا ''وطن''، مولوی محبوب عالم کا ''پیسہ اخبار''، مولانا ظفر علی خاں کا ''زمیندار'' اور مولانا ابوالکلام آزاد کا ہفتہ وار مصور ''الہلال''، یہ تمام اخبارات بڑے آب وتاب سے شائع ہوتے تھے۔ اور ان کے خریداروں اور پڑھنے والوں کا بڑا وسیع حلقہ تھا۔ ان میں الہلال مختلف حیثیتوں سے بہت ممتاز تھا۔ اور بہت ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ یہ اردو کا پہلا ہفتہ وار اخبار تھا، جو خاصی بڑی تقطیع پر نہایت دیدہ زیب ٹائپ میں چھپتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ مصور بھی تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی دلچسپی اور دلآویزی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اور اس کی آمد کا بڑی شدت سے ساتھ انتظار ہوتا تھا۔ اس مدرسہ میں اردو اور ضروری دینیات کے ساتھ کسی قدر فارسی اور عربی کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ صدر مدرس جماعت اہل حدیث کے ممتاز عالم مولوی خدا بخش صاحب مرحوم تھے۔ یہ بڑے اچھے فارسی داں، فارسی ادب وزبان کے روشناس اور فارسی ادبیات کے مسلم استاد تھے۔ الہلال کی معرب اردو کو، اردو کے مبتدی طلبہ تو درکنار، عربی کے طلبہ بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے مگر پڑھنے کا شوق سب رکھتے

تھے۔ مولوی خدا بخش صاحب مرحوم بھی باہمہ پیری و بزرگی وقدامت پسندی کے اس مصور رسالہ کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ اور جب تک پورا پڑھ نہیں لیتے تھے کہ کسی کو دیتے نہیں تھے۔ ایک مرتبہ اسی مدرسہ کے ایک منتہی طالب علم مولوی عبدالحق صاحب نے مولوی صاحب موصوف کے ہاتھ میں الہلال دیکھ کر اس کو پڑھنا چاہا۔ مولوی صاحب کو غصہ آ گیا، فرمایا تم کیا، تمہارے باپ بھی اس کو نہیں سمجھ سکتے! یہ پہلا دن تھا کہ میں نے الہلال کا نام سنا اور اسی کے ساتھ اس کی اس درجہ عظمت کا بھی پتہ چلا کہ ہر کس و ناکس اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ الہلال برابر آتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اسے حاصل کرنے اور پڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ کہ میرے حد فہم سے بالکل باہر تھا۔ لیکن خواہش میرے دل میں ضرور پیدا ہوتی تھی کہ کاش میں اس کو سمجھ سکتا، اسی مدرسہ میں جب اردو فارسی کی بقدر نصاب تعلیم ختم کر کے عربی شروع کی تو یہ مجلس ختم ہو چکی تھی۔ اور سارے اخبارات آنا بند ہو گئے تھے میں نے ابھی میزان ومنشعب ختم بھی نہیں کی تھی کہ مولوی خدا بخش صاحب مرحوم کا انتقال ہو گیا۔ کچھ دنوں میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر بھیج دیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مدرسہ کا نظم ونسق دیوبندیوں کے ساتھ سے نکل کر مولانا حمید الدین فراہی کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ وہ اس کے ناظم کل تھے۔ انہی کا مرتب کیا ہوا نصاب پڑھایا جاتا تھا۔ انہی کے پسندیدہ اساتذہ درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے۔ جن میں اکثریت ندوہ کے فضلاء کی تھی۔ مولانا شبلی نعمانی کے ہم نام وہم وطن اور ان کے خاص شاگرد و معتمد علیہ مولوی شبلی صاحب متکلم ندوی صدر مدرس تھے۔ وہ نہ صرف صدر مدرس و مہتمم تھے بلکہ مولانا شبلی اور مولانا فراہی کے نظریات وافکار وخیالات کے پرجوش نقیب بھی تھے۔ اور سرائے میر کو ندوہ کے سانچے میں ڈھال دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے وہاں سب کچھ کیا جس کے لئے ندوہ ہندستان کے سارے مدارس اسلامیہ میں ممتاز تھا "دارالمطالعہ" قائم کیا۔ ہفتہ وار جلسوں کا آغاز کیا۔ جن میں طلبہ اردو میں تقریر وتحریر کی مشق کرتے تھے۔ یہ زبان کی تعلیم وتربیت کا اتنا ضروری جز تھا کہ اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا تھا۔ ان جلسوں میں بنفس نفیس خود شریک ہوتے تھے۔ اور مقررین کی حوصلہ افزائی فرماتے تھے، کچھ ہی

دنوں کے بعد انہوں نے اپنے لائق ترین شاگرد مولانا عبدالرحمٰن نگرانی کو بھی بلا لیا۔ جو ندوہ کی تعلیم و تربیت کا بہتر نمونہ تھے۔

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مولانا شبلی کے آغوش پروردہ، تربیت یافتہ اور عجیب و غریب صفات کے بزرگ تھے، قدرت نے ان کی انتہائی کمسنی میں بہت سے کمالات جمع کر دیئے تھے، مولانا شبلی نعمانی ایک زمانہ میں آریوں کے تبلیغی مرکز گردکل کانگری سے بہت متاثر تھے۔ اس کے نمونہ پر اسلام کی تبلیغ اور آریت کی راہ روکنے کے لئے ''خدام الدین'' کے نام سے طلبہ کی ایک جماعت ندوہ میں تیار کی تھی، جس کے گل سرسبد ہی مولانا عبدالرحمٰن نگرامی تھے۔ مولانا شبلی نے اس جماعت کے لئے جو اصول بنائے تھے یعنی سادہ کھانا، سادہ پہنا، سادہ رہنا، زمین پر سونا، احکام و شعائر اسلام کی پابندی تقویٰ اور قناعت کی زندگی وغیرہ، ان کے سختی سے پابند تھے۔ وہ سرائے میر میں اسی سادہ وضع لباس میں آئے تھے۔ آپ کی سج دھج کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ندوہ کے فارغ التحصیل ہوں گے۔ گاڑھے کی دو پلہ ٹوپی، گھٹنے سے نیچا لمبا کرتہ، اور ایک خاص عربی کٹ کا ٹخنے سے اونچا پائجامہ، یہی ان کا پسندیدہ اور مخصوص لباس تھا، ان کی ذات پر ندوہ کے پورے حلقہ کو بڑا نادر تھا۔ مولانا عبدالباری، سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حمیدالدین فراہی سبھی ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اس کمپنی میں ان کے غیر معمولی علمی کمالات پر فخر کرتے تھے۔ ان کا ۲۸ برس کی عمر میں جب انتقال ہوا تو ندوہ کے پورے حلقہ میں ایک ماتم بپا ہو گیا اور سید صاحب نے تو معارف کی ایک اشاعت کے تمام شذرات ان کے ماتم کے لئے وقف کر دیے جس کا عنوان یہ تھا۔ ''آہ! ندوہ کا لعل شب چراغ گم ہو گیا''۔ وہ اس قدر رقت انگیز تھا کہ آج بھی اس کے پڑھنے سے گریہ طاری ہو جاتا ہے۔

یہ مولانا عبدالرحمٰن اپنے عنفوان شباب میں اردو کے جن شاعروں، انشاء پردازوں اور ادیبوں سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان میں ایک مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ وہ طلبہ کو خاص طور سے الہلال کے مطالعہ کی ترغیب دیتے تھے۔ طلبہ میں جو کوئی مولانا

کے اسلوب میں کوئی تحریر لکھتا تھا، اس کی بڑی داد دیتے تھے۔ میں نے بھی الھلال کا مطالعہ انہی کی ترغیب سے شروع کیا۔ وہ اردو سے عربی میں ترجمہ کے ساتھ عربی سے اردو میں ترجمہ تلخیص کی مشق بھی کرتے تھے۔ اکثر مصر کے مشہور عربی ماہناموں، المنار، الھلال اور المقتطف کے مضامین اور عبارتیں ترجمہ کرنے لئے دیتے تھے۔ اور میں غیر شعوری طور پر الھلال کلکتہ کی معرب اردو اور مولانا ابوالکلام کے خطیبانہ طرز انشاء میں ترجمہ کیا کرتا تھا، جس سے وہ بہت محظوظ ہوتے تھے۔ اور وہی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اور طلبہ اور اساتذہ سے فرماتے تھے کہ یہ ایک دن ابوالکلام ہوگا۔ اس کی تحریر میں مولانا ابوالکلام کے اسلوب انشاء کی بڑی ادائیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ محض ان کا حسن ظن تھا ورنہ میں کہاں اور مولانا کا معجزانہ اور خطیبانہ طرز انشاء کا تتبع کہاں، نہ مجھ میں اس کی صلاحیت تھی نہ میں ان کی توقعات کے مطابق ابوالکلام اور انشاء پرداز بنتا تو درکنار برجستہ لکھنے اور اپنے خیالات وافکار ومافی الضمیر کو آج تک ارادۃً ادا کرنے پر قادر ہوسکا۔

مولانا عبدالرحمٰن خود بھی مولانا ابوالکلام کے ادب وانشاء کے بڑے جانداده تھے۔ اس وقت ہمارے نصاب تعلیم میں مولانا فراہی کی تفسیر سورۂ والعصر بھی تھی، جو بطور ادب کی کتاب کے پڑھائی جاتی تھی اور انہی کے متعلق تھی، قرآن کے اردو ترجموں میں سب سے زیادہ مستند، دلنشیں اور معنی خیز ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا سمجھا جاتا ہے۔ اور اسی کو شیخ الہند مولانا محمود حسن نے بر تغیر خفیف اپنے ترجمہ پاک میں نقل کر دیا ہے، شاہ صاحب نے والعصر ان الانسان لفی خسر کا ترجمہ کیا ہے:

''قسم ہے زمانہ کی یا عصر کی نماز کی کہ بیشک آدمی ہر طرح نقصان میں ہے''۔

اوران کے لائق بھائی شاہ رفیع الدین صاحب نے یہ کیا ہے:

''قسم ہے عصر کی، تحقیق آدمی البتہ بیچ زیان کے ہے''

ان میں سے ایک با محاورہ ہے اور دوسرا تحت اللفظ، اور دونوں اپنی جگہ پر خوب ہیں۔ لیکن مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ان صاف وشستہ اور عام فہم ترجموں کو چھوڑ کر جن کو ایک معمولی اردو پڑھا لکھا بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے اور سمجھتا ہے۔ ابوالکلام کی زبان میں

اس کا ترجمہ اس طرح کرتے تھے کہ قسم ہے کہ زمانہ کی کہ انسان خائب و خاسر ہے، اب خائب و خاسر بغیر لغت کی مراجعت کے کون سمجھ سکتا ہے۔ چونکہ اس وقت ہم لوگوں پر ابوالکلامیت بے طرح غالب تھی۔ اس لئے جب مولانا گرامی نے اس کا ان الفاظ میں ترجمہ بتایا، تو ہم جھوم اٹھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے فصیح و بلیغ ترجمہ سے اس کو کیا نسبت ہے۔

افادہ و استفادہ کا یہ سلسلہ بڑے جوش اور سرگرمی سے جاری تھا کہ میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد میں اپنے چچا کی طلب پر اپنی دینی و عربی تعلیم نامکمل چھوڑ کر جس کو میرے والد نے بڑے ولولہ کی ساتھ شروع کرایا تھا، کلکتہ چلا گیا۔ میرے چچا کا ماحول بالکل کاروباری تھا وہ ٹامسن کے مشہور چمڑے کے گودام کے ناظم اعلیٰ تھے۔ چھ سو روپے تنخواہ پاتے تھے۔ مختلف قسم کا ذاتی کاروبار الگ تھا۔ اس ماحول میں علم و ادب کا گزر بھلا کہاں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ میرے چچا جان بالکل کاروباری ذہنیت کے آدمی تھے لیکن کتابوں کے مطالعہ کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کا بڑا اچھا ذخیرہ ان کے پاس تھا۔ انگریزی کے بلند پایہ اخبارات و رسائل کے ساتھ معارف اعظم گڑھ، زمانہ کانپور، اور صبح امید لکھنؤ کے مستقل خریدار تھے۔ موخرالذکر کے علی الترتیب ایڈیٹر دیا نراین نگم اور اردو زبان کے مشہور شاعر پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی تھے، جن میں سے ایک کی اردو زبان کی وسیع خدمات اور دوسرے کے شاعرانہ کمال سے سارا زمانہ واقف ہے۔ ایک زمانہ میں پنڈت دیا شنکر نسیم کی مشہور مثنوی گلزار نسیم کے حسن و قبح پر اودھ پنچ لکھنؤ کے صفحات میں جو ادبی معرکہ ہوا تھا۔ اس کے ایک فریق یہی چکبست لکھنوی تھے اور دوسرے عبدالحلیم شرر تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے اس موضوع پر خوب خوب دادِ سخن دی تھی۔ جو معرکہ چکبست و شرر کے نام سے کتابی شکل میں بھی آ گیا ہے۔ منشی جی نے ان سب رسالوں کی ہر ہر سال کی نہایت مطلاء مذہب جلدیں بندھوا کر رکھی تھیں۔ یہ ساری چیزیں میرے ذوق کی تسکین کا بڑا سامان بن گئیں۔ جن کو مکروہات دنیوی سے فرصت پا کر رات کی تنہائیوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا تھا۔ لیکن اس

ذخیرہ میں کلکتہ کا وہی صحیفہ ادب نہیں تھا جس کے مدیر شہیر کے طرز انشاء کا میں بہت گرویدہ تھا۔ اور اس کے تتبع کی کوشش کرتا تھا۔ یعنی مجلہ اسبوعیہ الہلال کلکتہ! میں جب کلکتہ پہنچا تو وہاں بڑے زور شور سے نان کواپریشن کی تجویز پر غور کرنے کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کے اسپیشل اجلاس کے انعقاد کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اسی کے ساتھ آل انڈیا خلافت کمیٹی کا خصوصی اجلاس بھی اسی کے شاندار پنڈال میں ہونے والا تھا۔ جس میں خاص طور سے شرکت کے لئے شیخ الہند مولانا محمود حسن بھی آنے والے تھے۔ جو ابھی ابھی مع اپنے تمام رفقاء کے مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان آئے تھے۔ لیکن اسی دوران میں ایک مختصر سی علالت میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اور اہل کلکتہ جو مدت سے ان کے لئے چشم بہ راہ تھے۔ ان کی زیارت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے۔ انہی بدقسمتوں میں ایک میں بھی تھا۔ کانگریس کے اسپیشل اجلاس کے وزیٹرس ٹکٹ بہت گراں تھے۔ جن کے خریدنے کی مجھ میں بالکل استطاعت نہیں تھی۔ اس لئے اس میں تو شریک نہ ہو سکا۔ لیکن خلافت کے اجلاس کے ٹکٹ ارزاں تھے۔ اور اس کے ایک شب کے اجلاس میں دو روپیہ کا ٹکٹ خرید کر شریک ہوا، یہ کسی آل انڈیا جلسہ میں شریک ہونے کا میرا بالکل پہلا اتفاق تھا۔ میں پنڈال میں داخل ہوا۔ تو مجمع دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ نشست بجائے فرش کے کرسیوں پر تھی۔ اس کے ایک طرف نہایت شاندار اسٹیج تھا، جس پر خلافت، کانگریس کے بہت سارے لیڈر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس اجلاس میں تقریریں تو بہت سے لوگوں نے کی ہوں گے لیکن ان میں سے مجھے صرف تین آدمیوں کے نام یاد رہ گئے ہیں۔ ایک مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر روزنامہ زمیندار، دوسرے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے بانی لالہ لاجپت رائے جن کو اس وقت غیر معمولی شہرت حاصل تھی۔ اور اردو انگریزی دونوں زبانوں میں بہت فصیح و بلیغ تقریر کرتے تھے۔ کانگریس کا اسپیشل اجلاس انہی کی صدارت میں ہو رہا تھا، تیسرے مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ جو نان کواپریشن کی تجویز کے سب سے بڑے مؤید تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا ان کی تقریر سے پہلے تعارف کرایا گیا۔ مولانا ظفر علی خان کی پرجوش تقریر اور لالہ لاجپت رائے کی وجد آفرین اور ولولہ انگیز تقریر کے بعد، ایک بلند بالا، قد آور باوقار و

پر تمکنت و پر جلال شخصیت کاندھوں پر ایک خاص انداز سے عبا ڈالے ہوئے۔ اور دونوں ہاتھوں سے اس کے کناروں کو پکڑے ہوئے نمودار ہوئی، بتایا گیا کہ یہ ہندوستان کے مشہور سحر بیان خطیب الہلال کلکتہ کے ایڈیٹر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ یہ سننا تھا کہ پورے مجمع کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں اور ہر شخص ان کی زبان شیوا بیان سے کچھ سننے کے لئے گوش بر آواز ہو گیا۔ لیکن یہ چند ہی جملے بول کر اسٹیج سے رخصت ہو گئے۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ میں نے مولانا ابوالکلام کو دیکھا۔ لیکن میں اسٹیج سے کافی فاصلہ پر وزیٹرس گیلری میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے باوجود بجلی کی روشنی کے میری حسرت دید پوری نہ ہو سکی۔ اور اس کو پورا کرنے لئے میں کسی اور مغتنم موقع کی تلاش میں لگ گیا۔

میرے کلکتہ کے زمانہ قیام میں مولانا ابوالحسنات صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین علاج کے لئے کلکتہ آئے، اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سفارش سے جن کے میرے چچا سے بڑے غیر معمولی تعلقات تھے۔ ان کے مہمان ہوئے، ان کی صحبت میرے لئے ایک ادب کش ماحول میں بہت زیادہ وجہ تسکین ثابت ہوئی ان کو عرق النساء کا مرض تھا جس کی وجہ سے چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے۔ وہ روزانہ متعدد اردو روزنامے خریدتے تھے اور میں پڑھتا تھا، وہ ایک زمانہ میں مولانا ابوالکلام کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل تھے۔ دارالمصنفین کے لئے ندوہ کے جن طلبہ پر مولانا شبلی نعمانی کی نگہہ انتخاب پڑی تھی۔ ان میں ایک مولانا ابوالحسنات ندوی بھی تھے۔ جب دارالمصنفین قائم ہوا تو سید صاحب نے ان کو یاد کیا۔ اور وہ الہلال سے استعفاء دے کر دارالمصنفین آ گئے۔ مگر کلکتہ کے زمانہ قیام میں مولانا ابوالکلام سے ان کے جو ذاتی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ دفتر الہلال سے علیحدگی کے بعد بھی قائم رہے۔ ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مولانا ابوالحسنات نے مولانا آزاد کو اپنی آمد کی اطلاع کے لئے مجھے انتخاب کیا۔ اور ایک خط لکھ کر دیا کہ جاؤ مولانا کو دے آؤ۔ میں بہت خوش ہوا کہ اس بہانے مولانا کی زیارت اور ملاقات دونوں کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔ شوق زیارت نے مجھ میں بجلی کی طاقت پیدا کر دی اور پیدل ایک گھنٹہ کا راستہ میں نے گھڑی دیکھ کر دس منٹ طے کر لیا۔ مولانا کا مکان ایک گلی

میں ایک چھوٹے سے احاطہ کے اندر تھا۔ سامنے کچا صحن تھا اس کے بعد مکان جو بہت معمولی دومنزلہ تھا۔ نیچے ایک لمبا برآمدہ تھا۔ جس میں دیوار سے لگ کر لکڑی کی ایک بنچ پڑی ہوئی تھی۔ زائرین اور ملاقاتی اسی بنچ پر آ کر بیٹھتے تھے۔ اور نمبر کی ترتیب سے ان کو ملنے کی اجازت ملتی تھی۔ اسی برآمدہ سے ملا ہوا ایک زمین دوز کمرہ تھا جس میں البلاغ پریس تھا۔ اس میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی۔ اور البلاغ پریس کے منیجر اور مولانا کے سارے کاموں کے نگران فضل الدین احمد صاحب بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، میں مولانا عبدالرزاق کو دیکھتے ہی پہچان گیا اور بنچ پر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ آمد کی ترتیب سے ملاقات کی اجازت ملے گی۔ اس حساب میرا نمبر بہت بعد میں آ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ معلوم نہیں کب تک بیٹھنا پڑے اور کب اجازت ملے۔ پریس کے کمرے میں چلا گیا۔ اور جرأت کر کے مولانا عبدالرزاق سے عرض کیا کہ مولوی ابوالحسنات صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین کا خط لایا ہوں۔ مہربانی کر کے آپ اس کو مولانا کے پاس بھجوا دیں۔ انہوں نے بڑی خوشی سے خط لے لیا اور ایک آدمی کے ذریعہ مولانا کے پاس بھجوایا، تھوڑی دیر کے بعد وہ آدمی میرے پاس آیا اور کہا کہ اب آپ جا سکتے ہیں اور میں یہ شعر پڑھتا ہوا لوٹ آیا:

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

میں مولانا کے آستانہ رُشد و ہدایت و دانشکدۂ علم و کمال سے بصد حرمان و مایوسی لوٹ تو آیا تھا، لیکن میں جو پیغام لے کر گیا تھا۔ وہ وہی حسرت دید کی تکمیل کا ذریعہ بن گیا۔ اسی کی صبح کو جبکہ ہم اپنی ضرورتوں سے ابھی فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ مولانا بے سان گمان مولوی ابوالحسنات صاحب کی عیادت کے لئے بنفس نفیس ہمارے گھر پہنچ گئے، جس کا ہم کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم کو قدرتی طور پر گھر بیٹھے اس دولت دیدار کے حصول سے جو بے پایاں خوشی ہوئی اس کا اظہار لفظوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے گھر کے سارے افراد میرے چچا منشی عبدالغفور صاحب ان کے داماد اور حافظ عبداللہ غازی پوری

کے نواسے مصطفےٰ انصاری وغیرہ مولانا کے اردگرد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مولانا کے استفسار حال پر مولوی ابوالحسنات صاحب نے اپنے ابتدائے مرض سے لے کر کلکتہ کے سفر تک کی پوری روئیداد مجملاً ان کو سنادی۔ مولانا نے ان سے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور فرمایا کہ کلکتہ میں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے ضرور یاد کیجئے گا۔ مجھے ان کے انجام دینے میں بڑی خوشی اور مسرت ہوگی۔ مولوی صاحب موصوف کی تفصیلات مرض کے علاوہ اور کن مسائل پر گفتگو اور بات چیت رہی، اب مجھے ان کی یاد بالکل باقی نہیں رہ گئی ہے، مولانا کے تخاطب کا ایک خاص انداز تھا۔ یعنی وہ مخاطب کی طرف انگشت شہادت اٹھا کر گفتگو کرتے تھے۔ مولانا کل ۱۵ منٹ بیٹھے ہوں گے اس درمیان میں ہم سب کی قوت بصارت ان کے سراپائے جمال کو دیکھنے اور قوت سماعت ان کی لب جاں بخش سے ان کے سخن ہائے شیریں کے سننے کی طرف مبذول رہی۔ کیف وسرور کا تو یہ عالم تھا کہ اس وقت ان کے وجود گرامی کے علاوہ دنیا اور اس کی ہر چیز میری نگاہوں میں غائب ہوگئی تھی۔

ایک مرتبہ تو محض حسن اتفاق سے مولانا کا تقرب حاصل ہوگیا تھا جس کی ایک لمبی تفصیل ہے۔ کلکتہ میں تقریباً شہر بھر کی مسجدوں میں جمعہ اور عیدین کی نمازیں ہوتی ہیں۔ لیکن شہر کا سب سے بڑا جمعہ زکریا اسٹریٹ کی مسجد ناخدا میں اور عیدین کا سب سے بڑا اجتماع قلعہ کے میدان میں ہوتا تھا جہاں مولانا کی اقتداء میں لاکھوں آدمی نماز پڑھتے تھے، مولانا کلکتہ سے خواہ کتنے ہی دور دراز فاصلہ پر ہوتے تھے لیکن عیدین اور خصوصاً عیدالفطر کے موقع پر کلکتہ ضرور پہنچ جاتے تھے۔ جب تک آپ کی امامت کا سلسلہ جاری رہا اس میں کبھی تخلف نہیں ہوا۔ مولانا اپنے حریم سعادت سے نکل کر جس شان وشوکت اور کروفر سے جلوہ گاہ امامت میں آتے تھے وہ نظارہ بڑا قابل دید، مرعوب کن اور مؤثر ہوتا تھا۔ قلعہ کی پوری آبادی اس پاس کے سارے انگریز اور بہت سے لوگ مسلمانوں کی اس ملی وحدت کا تماشا دیکھنے کے لئے آجاتے تھے۔ جن کا ہر چار طرف ٹھٹ کا ٹھٹ لگ جاتا تھا۔ مولانا انگریز تماشائیوں کے ہجوم سے گزرتے تھے، تو ان میں اور زیادہ تبختر پیدا ہو جاتا تھا۔ تاکہ وہ سمجھیں کہ اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمان یہ شان رکھتا ہے۔ اور اس

کی جلالت کا یہ عالم ہے وہ اسی طرح اکڑتے، تنتے اور شاندار اور پر رعب مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے سجادۂ امامت پر پہنچ جاتے تھے۔ نماز کے ختم ہونے کے بعد وہ خطبہ کے لئے ممبر پر چڑھ جاتے تھے اس وقت کا عالم بھی عجیب وغریب ہوتا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ پیغمبر وقت پورے یقین واذعان کے ساتھ اپنی امت سے خطاب کر رہا ہے اور خدائے لاشریک لہ کی وحدانیت اور خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی دعوت دے رہا ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ اخلاص واثر میں ڈوبا ہوتا تھا۔ یہ خطبہ کوئی رسمی خطبہ نہیں ہوتا تھا، جو عیدین کے موقع پر بندھے ٹکے الفاظ میں لوگوں کو سنا دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ حق ادا ہو گیا۔ بلکہ مسلمانوں کے لئے پورا درس عبرت وموعظمت ہوتا تھا۔ اس میں ان کے سال بھر کا نہ صرف دینی بلکہ ملی وقومی پروگرام اور لائحہ عمل بھی ہوتا تھا۔ کاش کہ عیدین کے یہ تمام خطبے محفوظ ہوتے، اور ان کا کوئی مجموعہ شائع ہوتا۔

میں انڈین ہاسپٹل روڈ عموماً اپنے گھر کے قریب ایک خوبصورت مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھتا تھا۔ اس میں روزانہ عصر جدید کلکتہ کے شہرہ آفاق ایڈیٹر، اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے لائق ترین اور ہونہار شاگرد مولانا شائق عثمانی بہاری بھی نماز پڑھتے تھے، جن کا اخبار کلکتہ کا سب سے زیادہ مقبول ترین اخبار تھا۔ اور بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے تھا۔

ایک مرتبہ اپنے پاس کی مسجد کو چھوڑ کر مسجد ناخدا میں جمعہ کی نماز پڑھنے چلا گیا۔ مولانا کے والد مولانا خیر الدین کے ایک بہت زیادہ مقرب مرید حاجی عبدالواحد حاجی زکریا تھے غالباً زکریا اسٹریٹ انہیں کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اپنے پورے نام کے بجائے ''حاجی واحدنا'' کے مخفف نام سے مشہور اور متعارف تھے۔ یہ مسجد مولانا خیر الدین کے ایما سے انہی صاحب خیر میمن تاجر کی بنوائی ہوئی ہے۔ مولانا خیر الدین اس کے مستقل امام اور بڑے رسوخ اور اثر کے مالک تھے۔ مولانا ابوالکلام نے جہاں اپنے والد کی وفات کے بعد ان کی اور بہت ساری چیزیں چھوڑ دی تھیں ان میں اس شہر کی اس سب سے بڑی مسجد کی امامت بھی تھی۔ جس کی ان کو کبھی خواہش نہیں پیدا ہوئی۔ لیکن اکثر وبیشتر لوگ

اپنے دور دراز مستقر اور مضافات تک سے چل کر جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے اسی مسجد میں آتے تھے۔ ایک مرتبہ جمعہ سے پہلے اعلان ہوا کہ نماز بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی خلافت کے مسئلہ پر تقریر کریں گے۔ میں اعلان سن کر خوش ہو گیا کہ آج میں نہ صرف مولانا کے شربت دیدار سے شادکام ہوں گا۔ بلکہ لذت تقریر سے بھی لطف اٹھاؤں گا۔ فرض نماز اور سنتوں سے فارغ ہونے کے بعد دونوں بزرگ برآمدہ کے بیچ کے در میں آکر پہلو بہ پہلو بیٹھ گئے، مجھے حسن اتفاق سے بالکل ان سے قریب بلکہ ''قاب قوسین اوادنیٰ'' کی حد تک نیچے صحن میں جگہ مل گئی۔ میری مالی حالت اس زمانہ میں ضرورت سے زیادہ خراب تھی۔ میری پاس پہننے کو کپڑے نہیں تھے اس وقت بھی میں بہت شکستہ حال اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا، انہیں مولانا ابوالحسنات سے جن کا ابھی ابھی اوپر کی سطروں کا ذکر ہوا ہے۔ کپڑوں کے لئے چار روپے قرض لئے تھے، جو میری جیب میں پڑے ہوئے تھے تقریر صرف مولانا محمد علی کی ہوئی۔ بہت پر درد اور رقت انگیز تقریر کے بعد مولانا محمد علی مرحوم نے مولانا ابوالکلام سے عرض کیا کہ چندہ کی وصولی کی آسان صورت یہ ہے کہ ایک پھاٹک پر آپ کھڑے ہو جائیں اور ایک پھاٹک پر میں اور خلافت فنڈ کے لئے چندہ اکٹھا کر لیا جائے، مولانا نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ بہت موثر الفاظ میں چندہ کی اپیل کی، ابھی اپیل ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ میں نے چاروں روپے جیب سے نکال کر مولانا محمد علی کے ہاتھ میں دے دیے۔ اس کے بعد مجھ پر کیا گزری یہ اب مجھ کو بالکل یاد نہیں۔ لیکن میں ان چار رپیوں کا جو مولانا ابوالحسنات سے لئے تھے آج تک مقروض ہوں۔ وہ اس مرض عرق النساء میں جس کے علاج کے لئے وہ کلکتہ آئے ہوئے تھے بہار کے راجگیر پہاڑ پر موت وحیات کی برسوں کش مکش کے بعد عین عالم شباب میں انتقال کر گئے اور میں ان کا قرض ادا نہ کر سکا، وہ بڑے ہونہار تھے، ندوہ سے عربی تعلیم کی تکمیل کی تھی اردو اور فارسی کا بڑا صاف ستھرا ذوق رکھتے تھے، شاعر بھی تھے۔ اور دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ مولانا شبلی کا فارسی کلیات اور صوفیانہ شاعری سے متعلق شعر العجم کا حصہ پنجم جو مولانا شبلی کی زندگی میں شائع نہیں ہو سکا تھا، نہایت کٹا پٹا مسودہ کی شکل میں تھا، انہی نے ایڈٹ کیا

تھا۔ ہندوستان کے مسلمان فرمارواؤں کے عہد کے اسلامی مدارس میں بھی انہوں نے معارف میں ایک مضمون لکھا تھا۔ جو ان کے انتقال کے بعد، دارالمصنفین کے سلسلہ تصنیفات کے تحت مولانا سید سلیمان ندوی کے دیباچہ اور مقدمہ کے ساتھ ''ہندستان کی اسلامی درسگاہیں'' کے نام سے کتابی شکل میں بھی آ گیا ہے، زندہ ہوتے تو معلوم نہیں اور کیا کیا علمی وادبی کارنامے ان سے انجام پاتے۔ ان کے انتقال سے دارالمصنفین کی جماعت رفقاء میں جو خلاء پیدا ہو گیا وہ پھر پر نہ ہو سکا۔ لیکن اس قرض سے جو میں ادا نہ کر سکا۔ گوناگوں یادیں وابستہ ہو گئی ہیں جو میرے لئے سرمایہ سعادت ہیں۔ جب میں اس قرض کو یاد کرتا ہوں تو معا مولانا محمد علی، مولانا ابوالحسنات اور مولانا ابوالکلام تینوں باکمال بزرگوں کی بے اختیار یاد تازہ ہو جاتی ہے اور میری آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا ابوالکلام نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مقابلہ میں جو گورنمنٹ بنگال کے انتظام میں تھا۔ تحریک ترک موالات کے زیر اثر ایک نیا مدرسہ اسی پیمانہ کا مسجد ناخدا میں قائم کیا تھا۔ جس کے صدر مدرس جانشین شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی تھے جو ابھی ابھی اپنے مرشد مولانا محمود حسن کے ساتھ مالٹا کی قید اسارت سے رہا ہو کر ہندوستان آئے تھے۔ اسٹاف میں ندوہ، فرنگی محل، دیوبند مختلف مکاتب فکر کے علماء شامل تھے۔ انہی میں میرے استاد مولانا عبدالرحمٰن نگرانی بھی تھے، جو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے بلائے گئے تھے، اور ادب کی کتابیں اور تفسیر پڑھاتے تھے، جس کا ان کو خاص ذوق تھا۔ ایک صاحب امروہہ کے تھے جن کے متعلق عربی کی ابتدائی کتابیں تھیں، مولانا ابوالکلام اس مدرسے کے اساتذہ اور طلبہ کے دریافت حال کے لئے بھی آیا کرتے تھے۔ مولانا حسین احمد مدنی کو مدینہ منورہ میں یک لخت ۱۴ برس تک رہ جانے کی وجہ سے اردو لکھنے پر کچھ زیادہ قدرت نہیں تھی، وہ اس زمانہ میں مولانا عبدالرحمٰن نگرانی سے اردو میں لکھنا سیکھتے تھے اور وہ مولانا مدنی سے حجاز اور عرب ملکوں کی عربی بول چال کی مشق کرتے تھے۔ یہ مدرسہ کچھ دنوں کے بعد بند ہو گیا۔ تو مولانا حسین احمد جمعیت علماء ہند کی تنظیم میں مصروف

ہو گئے اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کو ندوہ نے ادب اور قرآن وتفسیر کی تعلیم کے لئے بلا لیا۔ میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کے ساتھ رات کو عشاء بعد وسط کلکتہ کی سب سے زیادہ شاندار، وسیع اور فراخ سڑک سنٹرل ایونیو روڈ پر اکثر ٹہلا کرتا تھا، اور اس دوران موضوع گفتگو زیادہ تر وقت کی سیاسات، گاندھی جی، مولانا محمد علی وغیرہ ہوتے تھے۔ مولانا نگرامی ہندوستان کے ان دونوں جینئس لیڈروں سے بے انتہا متاثر تھے، ایک دن اسی سڑک پر چہل قدمی کے دوران مجھ سے فرمایا کہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں اور ان کے خطیبانہ اسلوب انشاء سے مرعوب تو بہت تھا، لیکن ان کو بہت زیادہ قابل اور غیر معمولی علم و فضل کا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔ میں ایک دن اس غرض سے ان کی خدمت میں گیا کہ پتا لگاؤں کہ ان کے علم و دانش اور فضل و کمال کی جو عام طور سے شہرت ہے وہ صحیح ہے، یا محض فریب یا جوش عقیدت! مولانا نگرامی نے فرمایا کہ میں بالکل تیار ہو کر گیا تھا خصوصاً قرآن اور عربی ادب سے سوالات استفسارات، اشکالات اعتراضات ذہن میں مرتب کر لیے تھے۔ میں نے ان کا ہر ہر طرح امتحان لیا۔ قرآن وحدیث وتفسیر سے گزر کر، فلسفہ، منطق اور دوسرے علوم عقلی تک کے متعلق ان سے استفسارات کر ڈالے۔ انہوں نے پورے تحمل اور ضبطِ نفس کے ساتھ میرے تمام سوالات کا جواب دیا۔ بلاشبہ ان کا مطالعہ بہت وسیع، ان کا علم بہت عمیق اور ان کا دماغ بہت تکتہ رس ہے۔ وہ علم و دانش کے بالیقین بحر زخار ہیں اور ان کے فضل و کمال کی جو شہرت ہے، بالکل صحیح ہے۔ قدیم کتابوں کے ساتھ مصر و شام کی جدید مطبوعات کا ذخیرہ بھی ان کے پاس بہت اچھا ہے۔ جو ان کے مطالعہ میں رہتا ہے۔ عربی کے جدید وقدیم ادب پر ان کی یکساں نظر ہے۔

میں نے اپنے قیام کلکتہ کے اس دور میں مختلف تقریبات کے سلسلہ میں مولانا ابوالکلام کی بار بار زیارت کی اور محمد علی پارک اور مسجد ناخدا میں متعدد بار ان کی تقریریں سنیں۔ لیکن ان میں سے صرف دو تقریروں کی کسی قدر یاد باقی رہ گئی ہے۔ ایک مسجد ناخدا کی تقریر جس میں خاص طور سے انہوں نے پنڈت مدن موہن مالویہ کا تذکرہ کیا تھا جن کی علمی زندگی سے مولانا اس وقت غالباً زیادہ متاثر تھے۔ اور ان کو وقت کا آئیڈیل انسان

سمجھتے تھے، فرمایا کہ مسلمان قوم میں اگر انہی کے جیسے فعال، سرگرم اور سراپا عمل دو چار اشخاص بھی پیدا جائیں تو مسلمانوں کی بگڑی بن جائے۔ دوسری محمد علی پارک کے ایک جلسہ کی تقریب جو جمنا لال بزاز کے اعزاز اور تعارف کے لئے منعقد ہوا تھا۔ پوری تقریر شروع سے آخر تک حیرت انگیز طور پر انہی کی مدح و منقبت پر مشتمل تھی۔ وہ تھے بھی بلاشبہ اسی کے لائق اور بڑی اخلاقی خصوصیات و فضائل کے حامل۔ قومی تحریکوں کے لئے ان کا خزانہ بیشتر کھلا رہتا تھا۔ وردھا کا تاریخی آشرم انہی نے گاندھی جی کے لئے تعمیر کرایا تھا، جو گاندھی جی کا مستقر اور ہندوستان کی سیاسیات کا برسوں مرکز رہ چکا ہے۔ اس سے آزادی کی جدوجہد کے زمانہ کی بہت سی روایات وابستہ ہوگئی ہیں، جن کو کوئی مورخ اس دور کی تاریخ لکھتے وقت نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ان بیچارے کا گاندھی جی کی زندگی ہی میں ۱۹۴۲ء کی انتہائی ہنگامہ خیز بلکہ فیصلہ کن ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک کے عین شباب میں انتقال ہوگیا۔

ان دو تقریروں کے سوا مولانا کی اور کسی تقریر کی یاد باقی نہیں رہ گئی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی علمی وادبی و ملی و سیاسی شہرت کی وجہ سے کلکتہ کیا سارے ہندوستان میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جہاں جاتے دھوم مچ جاتی تھی اوران کی زیارت اوران کی تقریر سننے کے لئے ہر چہار طرف سے لوگ امنڈ پڑتے تھے۔ لیکن رانچی کی چار سالہ نظر بندی نے ان کو لوگوں کی نگاہوں میں اور زیادہ مقبول اور محبوب بنادیا تھا۔ خصوصاً مسلمانان کلکتہ کی ان کی ذات کے ساتھ عقیدت و محبت تو پرستش کی حد تک پہنچ گئی تھی، ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جب وہ مسجد ناخدا کے جلسوں سے فارغ ہوکر اس کی سیڑھیوں سے نیچے اترتے تھے تو لوگ جوش عقیدت سے ان کے پانوں پر گرے پڑتے تھے اور وہ فرماتے تھے کہ یہ ناجائز ہے، یہ حرام ہے، شریعت نے اس سے منع کیا ہے۔ تمہارے ہی ایسا میں بھی ایک مجبور انسان ہوں۔ یہ طریقہ کسی بندے کے لئے قطعاً جائز نہیں ہے، یہ تم کیا کررہے ہو جو جبین نیاز خدا کے سامنے جھکنی چاہیے ایک بندے کے سامنے جھکا رہے ہو، اور اپنے ساتھ مجھ کو بھی گنہگار کررہے ہو۔ میں خدا کو کیسے

منہ دکھاؤں گا؟ بعض بعض وقت عقیدت مندوں کو ٹھوکر سے مار بھی دیتے تھے۔ ایک مرتبہ اسی محلہ میں تقریر سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے۔ ایک آدمی غلبہ حال سے ان کے پاؤں پر سجدہ ریز ہو گیا۔ انہوں نے حرام و ناجائز کہہ کر اس کو زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ تلملا اٹھا۔ فرمایا اس طرح کی تعظیم و تکریم صرف خدا کے لئے زیبا ہے۔ کوئی بندہ خواہ وہ روحانی و اخلاقی اور علم و عمل کے لحاظ سے کتنا ہی بلند اور ارفع و اعلیٰ ہو قطعاً اس کا مستحق نہیں ہے۔ جو لوگ اپنے لئے اس نیاز مندی کو، اس جوش عقیدت کو، اس وفور محبت کو پسند کرتے ہیں اور اسی کے ساتھ اس کو روا بھی رکھتے ہیں، خدا ان سے کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔ بندگی اور عبودیت میں خدا کے سارے بندے بلا استثنا برابر ہیں۔ اس کی بارگاہ نیاز میں گدائے بوریا نشین اور دارائے تاج و نگیں دونوں برابر ہیں۔ اس کی صف نماز میں محمود و ایاز ایک ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ پیشانی صرف خدائے واحد کے سامنے جھکنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس کو کسی بندۂ خدا کے سامنے جھکا کر داغدار نہ کرو، یہ وعظ و پند کرتے کرتے وہ گاڑی پر بیٹھ جاتے اور روانہ ہو جاتے، وہ قدموں پر گرنے کو تو درکنار دست بوسی تک کو بہت زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔

اس کے ٹھیک ۸ برس بعد جبکہ تمام ملک میں نہرو رپورٹ کا غلغلہ برپا تھا پھر کلکتہ جانے کا اتفاق ہوا۔ اس رپورٹ میں گورنمنٹ برطانیہ سے ڈومینین اسٹیٹس کا مطالبہ کیا گیا تھا، جس کی مدت ایک سال رکھی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں کے دو گروپ ہو گئے تھے۔ ایک موافقین کا اور دوسرا اس کے مخالفین کا، موخر الذکر کی قیادت مولانا شفیع داؤدی، مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی کر رہے تھے۔ بعد میں اس میں جمعیت علمائے ہند بھی شریک ہو گئی تھی۔ اور موافقین کی صف ڈاکٹر انصاری، سر علی امام اور راجہ صاحب محمود آباد تھے۔ جن کی سب برادریاں پنجاب اور بنگال خلافت کمیٹی کے ارکان تھے۔ جن کا علی الترتیب نام مولانا محمد علی نے پنجابی ٹولی اور بنگالی ٹولہ رکھا تھا۔ رپورٹ کے موافقین و مخالفین میں اس وقت خوب خوب معرکہ آرائی جاری تھی۔ نہرو رپورٹ کی تشریح میں ڈاکٹر انصاری کے ایک انتہائی سنجیدہ اور مدلل بیان سے متاثر ہو کر میں رپورٹ کے موافقین کا ہم نوا ہو گیا

تھا۔ رپورٹ پر غور و فکر کرنے کے لئے لکھنؤ کی قیصر باغ کی تاریخی بارہ دری میں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو جلسہ ہوا تھا اس میں تو میں شریک نہ ہو سکا تھا لیکن کلکتہ میں کانگریس کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ جس کا موضوع یہی رپورٹ تھی تو میں نے اس کی شرکت کے لئے خاص طور سے اپنے وطن اعظم گڑھ سے شدِ رحال کیا۔ کانگریس کے کمپاؤنڈ میں اسی کے اہتمام میں آل پارٹیز کنونشن کا بھی اجلاس تھا جس میں ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کے لیڈر شریک تھے، اس کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے، اس میں جہاں ہندوستان کے تمام ممتاز لیڈروں اور راہنماؤں کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس میں ایک مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ جو ڈائس کے نیچے کی صف میں بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ مجمع کی طرف رخ کئے ہوئے تھے، سر پر کلپاخ کی سیاہ اونچی بال دار ٹوپی، سفید کھدر کی برق دم شیروانی اور اس پر سفید چادر جس کے دونوں کنارے چلتے وقت زمین پر گھسٹتے تھے۔ ٹانگوں میں کھدر کا ٹخنوں سے نیچا پائجامہ اور پیروں میں نہایت نفیس ناگرہ شو، جلسہ کی کارروائی ایک بجے کے بعد شروع ہوئی اور شام تک رہی۔ لیکن اس درمیان میں مولانا نہ کسی کی طرف مخاطب ہوئے۔ نہ کچھ بولے نہ کوئی تقریر کی۔ پھر میں نے ان کو کانگریس کے پنڈال میں کھلے اجلاس کے موقع پر اس وقت دیکھا جب صدر منتخب پنڈت موتی لال نہرو، کانگریس کے سابق صدروں کے ساتھ ایک جلوس کی شکل میں کانگریس کی مسند صدارت کو زینت دینے کے لئے جا رہے تھے۔ ان میں جہاں اور بہت سے سابق صدر تھے جنہوں نے کانگریس کے مختلف سالانہ اجلاس کی صدارت کی تھی، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے جنہوں نے علی الترتیب کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کرکوناڈا (مدراس) اور اسپیشل اجلاس منعقدہ دہلی کی صدارت کی تھی۔ ایک دن کانگریس کے کمپاؤنڈ ہی میں ایک چھوٹے سے خیمہ میں بھی ٹھیک مغرب کے وقت وہ نظر آئے تھے شاید ایک چھوٹی سی میز تھی۔ جس کے اردگرد اور بہت سے لیڈر بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا کے منہ سے سگار لگا ہوا تھا جس کے وہ بے حد عادی تھے۔

کانگریس کے صدر منتخب پنڈت موتی لال نہرو اپنے اہل خاندان اور دوستوں

کے ساتھ جن میں بڑی تعداد نہرو رپورٹ کے مسلمان حامیوں کی تھی۔ کڑاپہ کے قریب جہاں ۸۴ ایکڑ کے وسیع رقبہ میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا، تھیٹر روڈ میں ایک عظیم الشان اور لق و دق بلڈنگ میں ٹھہرے ہوئے تھے یہیں میں نے عمر میں پہلی مرتبہ ٹیلیفون سے کام لیا۔ مولانا مسعود علی ندوی، ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ جو اس زمانہ میں کانگریس کے ایک مقبول و ممتاز لیڈر اور پنڈت موتی لال نہرو کے بڑے نیازمندوں میں تھے۔ اس کے ایک کمرہ میں مقیم تھے۔ نہرو رپورٹ کے ان حامیوں کی ملاقات کے لئے مولانا ابوالکلام بھی اکثر آتے تھے یہیں میں نے پہلی مرتبہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کو ایک مجلس میں دیکھا عارف ہسوی، بمبئی کرانیکل کے مشہور روزگار ایڈیٹر عبداللہ بریلوی اور مولانا مسعود علی ندوی وغیرہ شریک تھے میں بھی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ مجلس شبینہ دیر تک رہی، چائے کا دور بھی چلتا رہا۔ ڈاکٹر انصاری اس وقت نہرو رپورٹ سے مسلمانوں کے سواد اعظم کی مخالفت کی وجہ سے بہت متردد اور پریشان تھے، اور زیادہ تر عبداللہ بریلوی سے مخاطب تھے وہ بالکل انگریزی لب و لہجہ میں مسٹر بریلوی کہہ کر ان کو مخاطب کرتے تھے تو بڑا جی لگتا تھا، لیکن وہ دل و دماغ کے لحاظ سے بڑے مشرقی اور مشرقیت نواز تھے جنگ بلقان کے زمانہ میں زخمی ترکوں کی مدد کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے طبی مشن انہی کی سرکردگی میں قسطنطنیہ گیا تھا۔ مولانا ابوالکلام کو مولانا مسعود علی سے بھی بڑی دلچسپی تھی وہ اس کانگریس ولا میں آتے تھے تو ان سے بھی خاص طور سے ملاقات کرتے تھے ایک مرتبہ تشریف لائے تو ان کے ساتھ ایک صاحب اور بھی تھے جو یقیناً ہندوستان کے کوئی مشہور و معروف لیڈر رہے ہوں گے۔ انہوں نے اس گرم جوشی کے ساتھ مولانا مسعود علی سے ملتے ہوئے دیکھ کر مولانا ہی سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں، فرمایا، آپ ان کو نہیں جانتے، یہ مولانا مسعود علی ندوی ہیں۔ اور ان ہی نے کنانور میں دارالمصنفین قائم کیا ہے۔ کنانور کرنول کی بگڑی ہوئی صورت ہے، جہاں کے رہنے والے افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق مدراسی تھے، اور جو اس دور میں کچھ دنوں آندھرا دیس کا دارالسلطنت رہ چکا ہے مولانا کی زبان مبارک سے یہ فقرہ نکلنا تھا کہ قہقہہ بلند ہو گیا۔ مولانا کے مقابلہ میں کس کو

جرات تھی کہ کوئی فقرہ چست کرتا، کنانور اور اعظم گڑھ میں ریشم اور سوت کے کپڑے کی صنعت کے لحاظ سے جو مناسب ہے وہ ظاہر ہے اعظم گڑھ کپڑے کی صنعت اور تجارت کے اعتبار سے دوسرا کنانور ہے یہ مزاح جاری تھا کہ کسی نے کہا مولانا اس وقت مسلم، انسٹی ٹیوٹ ہال میں مسلم لیگ کا جلسہ ہو رہا ہے جس کو مسٹر جناح خطاب کریں گے۔ مولانا نے کہا ہاں ہاں آپ لوگ ضرور جلسہ میں جائیں، دیکھئے وہ کیا کہتے ہیں۔

کانگریس کا کھلا اجلاس شروع ہونے سے پہلے کانگریس کا صدر منتخب جلوس کے ساتھ جس کے جلو میں کانگریس کے تمام پچھلے صدر ہوتے ہیں۔ پنڈال میں داخل ہوتا ہے، یہ منظر بڑا دل کش ہوتا ہے اس جلوس میں شرکت کرنے کے لئے مولانا محمد علی بھی آ گئے تھے۔ آگے آگے صدر منتخب پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ اور ان کے پیچھے سابق صدروں کی ایک لمبی قطار، جس میں ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام بھی شامل تھے۔ جو ۱۹۲۳ء کے کانگریس کے اسپیشل اجلاس منعقدہ دہلی کے صدر تھے۔ اجلاس ابھی شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ کانگریس کے نمایندوں نے مطالبہ کیا کہ ہم بردولی ستیہ گرہ کے ہیرو سردار پٹیل کا درشن کرنا چاہتے ہیں۔ سردار پٹیل فرط خاکساری کی بنا پر اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ لیکن جب لوگوں کا اصرار بڑھ گیا تو دو منٹ ہاتھ جوڑ کر اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ یہ ان کی زیارت کا پہلا اتفاق تھا، اور آخری بھی۔ پھر میں نہ کبھی اپنے وطن اعظم گڑھ سے نکلا، نہ کسی بڑے لیڈر کی پھر کبھی زیارت نصیب ہوئی۔ اس وقت تو سردار پٹیل گاندھی جی کے بڑے چہیتے ساتھی اور بردولی ستیہ گرہ کے ہیرو کی حیثیت سے مشہور تھے، لیکن اس کے بعد انہوں نے کانگریس میں بڑی قوت حاصل کر لی۔ اور اس کے پورے در و بست پر چھا گئے اور سارے ملک میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں گاندھی جی کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئے۔ ان کی رائے کانگریس کی سرکاری رائے سمجھی جانے لگی۔ وہ جس سے ناراض ہوتے تھے وہ ہمیشہ کے لئے گر جاتا تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد ملک اور کانگریس کی طاقت انہی کے ہاتھ میں تھی۔

کانگریس کے اسی سیشن کا یہ واقعہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صدر منتخب پنڈت

موتی لال نہرو آنجہانی نے اپنا خطبۂ صدارت انگریزی میں پڑھنا شروع کیا تو جلسہ کے ہر گوشہ سے ہندوستانی اور اردو میں پڑھنے کا اتنا شور بلند ہوا کہ ان کی آواز دب کر رہ گئی اور وہ خاموش ہو کے بیٹھ گئے جب شور وغوغا ختم ہوا تو کھڑے ہوئے اور نہایت فصیح و بلیغ اردو میں فرمایا:

"میں بھی ملکی ہی زبان میں تقریر کرنے کا حامی ہوں۔ خود کانگریس بھی یہی چاہتی ہے، اور جب کبھی کانگریس کے ہاتھ میں ملک کی باگ دوڑ آئے گی تو بجائے انگریزی کے جو ہماری غلامی کی یادگار ہے اور جس کا کوئی تعلق ہماری مشترکہ ہندوستانی تہذیب، تمدن اور کلچر سے نہیں ہے۔ یہی زبان ملک کی سرکاری زبان ہو گی۔ اس وقت بھی میری مادری زبان اردو ہی ہے اور میں اپنے خیالات و اذکار اور کانگریس کا پیغام اسی زبان میں نہایت حسن وخوبی کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن یہاں اولاً تو مدراس، برما، آسام اور گجرات جیسے صوبوں کے نمائندے آئے ہیں جو یہ زبان اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ دوسرے یہ تقریر اس وقت ساری دنیا میں سنی جائے گی، اور انگریزی ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے افادۂ عام کے خیال سے مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں انگریزی ہی میں اپنا خطبہ صدارت پڑھوں"۔

میں نے پہلی مرتبہ اس جلسے میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال دیکھا جو نیا نیا ایجاد ہو کر آیا تھا، لیکن وہ پورا کام نہیں کر رہا تھا۔ اور رہ رہ کر اس میں خرابی پیدا ہو جاتی تھی۔ کسی کی بھی تقریر خوب سننے میں نہیں آئی۔ مولانا محمد علی تو صدر کے جلوس سے فارغ ہو کر واپس چلے گئے، لیکن مولانا ابوالکلام ڈائیس پر شروع سے آخر تک موجود رہے۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو بھی، جن کو اس زمانے میں اچھی طرح شہرت حاصل تھی اور نہرو رپورٹ کے بڑے حامیوں میں تھے۔ پہلی اور آخری مرتبہ یہیں دیکھا تھا۔

کانگریس کا سالانہ جلسہ جہاں ہوتا ہے کچھ دنوں کے لئے وہاں پورا ایک شہر آباد ہو جاتا ہے۔ اسٹیشن، ڈاکخانہ، بینک سب کھل جاتا ہے۔ اس جلسے کے ساتھ آل پارٹیز کنونشن اور بہت سی دوسری کانفرنسوں کے ساتھ جو مختلف اوقات میں اس کے احاطہ میں منعقد ہوتی رہیں۔ ایک عظیم الشان نمائش بھی تھی۔ جس میں بڑی بڑی نادر چیزیں اکھٹا کی گئی تھیں۔ اس میں ہندوستان کے عہد بعہد کی گذشتہ تہذیب اور کلچر کو بھی دکھایا گیا تھا۔ جو بہت ہی دلچسپ اور علمی و تاریخی تھا۔ مولوی مسعود علی صاحب ندوی مولانا ابوالکلام نے خاص طور سے ہدایت فرمائی تھی کہ آپ نمائش ضرور دیکھئے۔ اس سے آپ کو بہت دلچسپی پیدا ہوگی۔ میں نے اسی نمائش میں پنڈت جواہر لال نہرو کی بیوی کملا نہرو کو ایک رکشے پر اس کے اندر گھومتے ہوئے دیکھا۔ اور ڈاکٹر سید محمود پیدل ان کے ساتھ تھے، ان کو دق کی بیماری، جس میں ان کا انتقال ہوا شروع ہو چکی تھی۔ جسم حد درجہ زار و نزار اور چہرہ بالکل پژمردہ تھا، پنڈت جواہر لال نہرو کی اکلوتی صاحبزادی اندرا اسی کے بطن سے ہیں جو اپنی تمام خاندانی روایات، خصوصیات اور اخلاق کی حامل اور اپنے باپ اور دادا ہی کی طرح ملک میں مقبول اور عزت و احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس خاندان کے ساتھ مولانا ابوالکلام کو جو تعلق، ربط اور اخلاص تھا اور خود اس خاندان کے لوگ ان کے جتنے قدر دان عظمت شناس اور ان سے خلوص رکھتے تھے۔ اس سے بھی لوگ واقف ہیں۔ مولانا کی آخری کتاب جس کو پروفیسر ہمایوں کبیر نے مرتب کیا اور انگریزی کا جامہ پہنایا ہے یعنی انڈیا ونس فریڈم اس میں پنڈت جواہر لال کے طریقہ کار، انداز فکر، زاویہ نظر اور ان کے بعض پالیسیوں پر سخت تنقید کی گئی ہے، بلکہ پاکستان بننے تک کی ذمہ داری انہی پر ڈال دی گئی ہے، پھر بھی جب پنڈت جی موصوف نے بڑی فراخ دلی سے اس کی اشاعت کی اجازت دے دی، اور فرمایا کہ مولانا نے اپنی صواب دید سے جو کچھ لکھا ہے وہ ضرور منظر عام پر آ جانا چاہیے۔ یہ مولانا کے ساتھ پنڈت جی کے انتہائے خلوص اور تعلق خاطر کی دلیل ہے جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے:

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

مولانا ابوالکلام آزاد

اور

اکابر و معاصر

حضرت سید محمد جونپوری
اور
مولانا ابوالکلام آزاد

سید محمد جونپوری، جون پور کے رہنے والے تھے۔ ۱۴۴۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے جو شدید مخالف تھے، وہ بھی اعتراف کرتے ہیں، کہ علوم رسمیہ میں کمال کے ساتھ زہد و درویشی اور ورع و تقویٰ میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ الشیخ علی متقی جو ان کے معاصر اور سخت مخالف تھے، اور ان کے رد میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے، وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا ابتدائی عہد کمال زہد و تقشف اور استغراق و استہلاک باطنی میں گزرا، سات سال تک ان کا یہ حال رہا کہ پے در پے روزہ رکھتے اور تن تنہا ایک گوشہ میں پڑے رہتے، اسی اثنا میں ان پر یہ کیفیت طاری ہوئی کہ ان کو محسوس ہوا، کہ کہیں سے صدا آ رہی ہے کہ انت المہدی، تم مہدی ہو، برسوں تک متامل اور سوچتے رہے، کہ معاملہ کیا ہے، لیکن جب یہ آواز مسلسل سنائی دی، تو انہوں نے اپنے مہدی ہونے کا اعلان کر دیا۔ نویں صدی کا زمانہ جو اکبر سے پہلے گزرا، وہ بڑا ہی پر آشوب تھا سخت بدامنی اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ روز روز بادشاہتیں قائم ہوتیں اور ختم ہو جاتی تھیں۔ کوئی مرکزی حکومت باقی نہیں رہی تھی، جو احکام شرع کے اجرا اور قیام کی ذمہ دار ہوتی، علمائے دنیا ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، اور وہ طرح طرح کے فتنے برپا کرتے رہتے تھے۔ دنیا طلبی اور مکر و زور کی گرم بازاری تھی۔ ان سب سے بڑھ کر یہ تھا کہ صوفیوں کی بدعات و منکرات نے ایک عالم کو

گمراہ کر رکھا تھا، یہ حال سید صاحب موصوف سے دیکھا نہ گیا، اور انہوں نے بلاخوف لومۃ لائم احیائے شریعت اور قیام امر بالمعروف کا غلغلہ بلند کر دیا اور لوگوں سے کہا کہ اس وقت مجاہدہ وریاضت اور ذکر وشغل کی ضرورت نہیں ہے۔ سب سے بڑا مجاہدہ یہ ہے کہ خلق اللہ کو سیدھی راہ پر لگاؤ اور احکام شرعیہ کے اجرا کی راہ میں اپنی جانیں لڑا دو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دعوت وتذکیر میں ایسی تاثیر بخشی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں آدمی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئے اور متعدد فرماں روایاں وقت نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، ان کے معتقدین کے طور وطریق ایسے عاشقانہ اور والہانہ تھے، کہ ان کو دیکھ کر صحابہ کرام کے خصائص ایمانی کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، انہوں نے خون کے رشتوں اور وطن وزمین کی الفتوں کو ایمان ومحبت الٰہی کے رشتہ پر قربان کر دیا تھا، اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے راہ حق میں نکل پڑے تھے، اور ایک دوسرے کے رفیق وغم گسار بن گئے تھے، اور بجز خلق اللہ کی ہدایت، خدمت اور احکام شرع کے اجرا کے، دنیا کے اور کسی کام سے ان کو واسطہ نہ تھا جو ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوتا، اُس کے لیے تین منزلوں سے گزرنا ضروری تھا، ایک یہ تھی، کہ جو اس راہ میں قدم رکھے، وہ قیدِ وطن سے آزاد اور گھربار چھوڑ کر اپنے برادران طریقت کا ساتھی اور غم گسار بن جائے، دوسری منزل ترک مال کی ہے، یعنی اُس کے پاس جو کچھ ہو، وہ اپنے یاران طریقت میں بانٹ دے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ، تیسری منزل اس راہ کی ترک جان کی ہے فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِیْنَ، اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو، یعنی ہر وقت راہ حق میں سربکف رہو، اگر اعدائے شریعت سرنگوں نہ ہوں تو قوتِ حدید سے کام لو فیہ باس شدید۔ یہی چند باتیں تھیں، جن پر ان کے حلقہ ارادت میں داخل ہونے کے بعد عمل کرنا ضروری تھا، اور سب کی سب بالکل حق تھیں، عشق ومحبت الٰہی کی راہ میں جاں سپاری کتنی بڑی سعادت ہے لیکن افسوس کے آگے چل کر خود ان کے نادان معتقدوں نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔

ان کی یہ تعلیمات تھیں، جن کو ان کے موافقین اور مخالفین سب نے لکھا ہے، لیکن ان کے معتقدین نے ان کو شرع کا رنگ دے دیا اور مخالفین کو ان کی مخالفت کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا اور بعض باتوں کو تکفیر و تفسیق کے لیے حجت ٹھہرا لیا، افسوس ہے کہ دنیا کی تاریخ ہدایت و اصلاح امم کی نصف گتھیاں اس سوءِ فہم اور تاویل و تعبیر باطل کی الجھائی ہوئی ہیں، کہا کچھ گیا، معتقدین نے غلو کیا اور مخالفین نے تعصب و تشدد سے کام لیا اور اس تاریکی میں اصل حقیقت گم ہو کر رہ گئی۔

چو بشنوی سخن اہل دل مگو کہ خطاست
سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

اس راہ کا سب سے بڑا فتنہ یہی سُوءِ فہم ہے، بتلانے والوں نے کہا کیا تھا اور سمجھنے والوں نے سمجھا کیا، ان غلط فہمیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہر طرف سے مخالفت ہونے لگی، پہلے تضلیل و تکفیر کا سلسلہ چلا، پھر قتل و سلب تک نوبت پہنچی، وہ سب سے زیادہ علمائے دنیا کو ان کی ہوا پرستیوں اور غفلت پر سرزنش کرتے تھے۔ جب مخالف کا بہت زور ہوا تو گجرات چلے گئے، سلطان محمود کلاں صورت دیکھتے ہی معتقد ہو گیا، لیکن علمائے سوء نے ان کو وہاں بھی نہیں بخشا اور مخالفت شروع کر دی، مجبوراً حجاز و عرب کا رخ کیا، وہاں سے ایران گئے، سلطان اسماعیل صفوی کا زمانہ تھا، اس نے اردگرد ہجوم خلائق دیکھا، تو ایران سے نکل جانے کا حکم دے دیا، ہندوستان کی طرف دوبارہ واپس آ رہے تھے کہ فراہ میں انتقال ہو گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی ۹۱۱ ھ کے واقعات کے سلسلہ میں لکھتے:

> ''دریں سال میر سید محمد جونپوری قدس سرہ از اعاظم اولیائے کبار کہ دعوے مہدویت از سر برزدہ بود، ہنگام مراجعت از مکۃ معظمہ بجانب ہند در بلدۃ فراہ داعی حق را لبیک فرمود''

اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ مکہ معظمہ ہو کر ہندوستان آ رہے تھے، اور جب فراہ میں پہنچے تو انتقال کر گئے۔

ان کی طرف طرح طرح کے دعاوی و شطحیات منسوب کیے گئے، معتقدین کو تو

چھوڑ یئے، کہ وہ جس سے عقیدت رکھتے ہیں، تو اس کو خدا بنائے بغیر نہیں رہتے، زیادہ احتیاط کی تو اس کو نبوت تک پہنچا دیا، لیکن ان کے معاملہ میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی تک یہ لکھتے ہیں:

> ''سید محمد جونپوریؒ کا یہ اعتقاد تھا کہ جو کمال محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکھتے تھے، وہی کمال ان کو بھی حاصل تھا، فرق اتنا تھا کہ حضور کو براہ راست خدا کی طرف سے یہ کمال حاصل ہوا تھا، اور ان کو حضور کے اتباع میں۔ تبعیت رسول اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ روحانی کمالات میں انہی کی طرح ہو گئے''

لیکن شاہ صاحب نے یہ نہیں لکھا کہ سید موصوف نے یہ بات کہی یا ان کے مریدین و معتقدین کی پیر پرستانہ منقبت سرائی ہے۔ ''ام العقائد'' جو ان کی طرف منسوب ہے، وہ ان کے مریدوں کی لکھی ہوئی ہے، صاحب ''ہدیہ مہدویہ'' نے اس کی عبارتیں نقل کی ہیں، لیکن ان کا انتساب سید محمد کی جانب مشکوک و محل نظر ہے، بہر حال اس قسم کی باتیں دو حال سے خالی نہیں، یا تو یہ معتقدین کا غلو، افراط عقیدت سوء فہم اور زیغ نظر ہے، یا غلبہ حال کا نتیجہ ہے۔ جو اس راہ کے بڑے بڑے کاملین دواصلین تک کو پیش آئے ہیں، کسی نے اس عالم میں ''لوائی ارفع من لواء محمد'' کہا، اور کوئی ''سبحانی ما اعظم شانی'' پکار اٹھا، اور کوئی کچھ اور کوئی کچھ:

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مست

تو اگر ان تمام حضرات کی طرف سے مغلوبیت سکر و حال کا نتیجہ قرار دے کر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے، اور ان کے اسلام و ایمان پر شک نہیں کیا جاتا، تو پھر حضرت سید محمد جونپوری نے کیا قصور کیا ہے کہ کمال زہد و ورع اتباع شریعت، قیام امر بالمعروف ونہی عن المنکر، ایثار فی اللہ وغیرہ کی بنا پر جس سے موافق تو موافق مخالف تک کو انکار نہیں، ان کو حسن ظن اسلامی کا مستحق نہ سمجھا جائے، اور صرف چند کلمات غریبہ کی بناء پر جن کی

اصلیت مشتبہ ہے، ان کو مومن نہ سمجھنے پر اتر آئیں:

لالہ ساغر گیر ونرگس مست و برما نام فسق
داوری خواہم مگر یارب کراادا ورنکنم

مہدوی فرقہ ان ہی بزرگ کی طرف منسوب ہے، اس کی بنیاد تو درحقیقت صداقت وحق پرستی پر پڑی تھی، یعنی دعوت حق، احیائے شریعت، قیام فرض امر بالمعروف و نہی المنکر۔ خود سید محمد اوران کے پیرو بڑے ہی پاک نفس اور خدا پرست تھے، جن کو دیکھ کر خدایاد آجاتا تھا، لیکن افسوس کہ رفتہ رفتہ اس کی بنیادی صداقت غلو و محدثات میں گم ہوگئی۔ اور فرقہ مہدویت کو مسلمانوں کے گمراہ فرقوں میں شامل کرلیا گیا اور اس وقت سے اس کے خلاف نکیر شروع ہوئی جواب تک قائم ہے۔ (ملخص از تذکرہ ابوالکلام آزادؒ)

یہ مولانا ابوالکلام آزاد پہلے بزرگ ہیں، جنہوں نے تاریخ کے حقائق کی روشنی میں اپنی اس کتاب ''تذکرہ'' میں ان کی طرف سے صفائی پیش کی ہے اور ان کی امر بالمعروف، نہی عن المنکر، احیائے شریعت اور دعوت کا علم بردار قرار دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سید محمد جونپوریؒ نے خود اس کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ انہوں نے کبھی اپنے کو مہدی موعود سمجھا اگر عالم سکر میں یہ الفاظ ان کی زبان پر آ گئے تھے، تو سکر کی کیفیت دور ہو جانے کے بعد اس کی تردید بھی فرمادی، جیسا کہ خزینۃ الاصفیاء اور تحفۃ الکرام وغیرہ میں ہے۔ مرأۃ محمدی کے مصنف نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے، کہ ان کی دعوت حق کی جو تحریک ہندوستان سے گزر کر ایران وعرب وحجاز تک پہنچ گئی تھی، اور جس کے حلقۂ ارادت میں وقت کے بڑے بڑے سلاطین، علماء اور زہاد تک آ گئے تھے، مولانا ابوالکلام کی قلم برداشتہ چند سطروں کے سوا جو ضمناً علمائے دنیا پرست کے ذکر کے سلسلہ میں تذکرہ میں آ گئی ہیں، اردو میں اب تک کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ ایک صاحب نے الفرقان لکھنؤ میں فارسی کے بعض تذکروں کی مدد سے اس پر لکھنا شروع کیا، تو وہ بھی مواد کی کمی سے تشنہ رہ گیا، زیادہ تر انہوں نے اسی تذکرہ کو اپنے مضمون کا مبنی قرار دیا ہے، اپنی کوئی نئی تحقیق جیسا کہ توقع تھی، پیش نہیں کی ہے

ضرورت ہے کہ کوئی صاحب اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں، عربی و فارسی و اردو میں سید محمد جونپوری اور ان کی تحریک مہدویت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کو تلاش کر کے منظر عام پر لائیں۔ خود ابوالکلام صاحب نے بھی اس کو تذکرہ میں ضمناً لکھا ہے، تحقیق کا حق جیسا کہ چاہیے تھا، ادا نہیں کیا ہے، شیر شاہی اور سلیم شاہی عہد کے اکابر اولیاء میں ایک بزرگ شیخ داؤد جہنی دال تھے، ان پر مہدوی ہونے کا شبہ تھا، اتنی ہی بات مخدوم الملک کی مخالفت کا سبب بن گئی، جو اس وقت بڑے اقتدار کے مالک تھے، اور جو چاہتے تھے، ان سوری فرماں رواؤں سے منوا لیتے تھے، لیکن شیخ پر یہ الزام ثابت نہ ہو سکا، ورنہ ان کے لئے بھی جام شہادت تیار ہو جاتا، جو مخدوم الملک کے ہاتھوں بعض دوسرے اہل اللہ کو پینا پڑا، انہی بزرگ کے سلسلہ میں سید محمد جونپوری اور ان کی تحریک مہدویت پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہماری زبان کے مغل دور کے مشہور مؤرخ سید صباح الدین عبدالرحمٰن اپنی کتاب ''بزم تیموریہ'' کے دوسرے ایڈیشن کی پہلی جلد میں جو صرف بابر سے لے کر اکبر تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ اکبری عہد کے امراء کے ذیل میں مخدوم الملک کے متعلق رقم طراز ہیں:

''مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری کا لقب تھا، یہ مضافات لاہور کے رہنے والے تھے، ان کا خاندان انصاری تھا، عربی، اصولِ فقہ، تاریخ اور علوم منقولات میں ان کو بڑی اعلیٰ دستگاہ حاصل تھی، علوم دینی میں اپنی اعلیٰ قابلیت کی بنا پر، ہمایوں کے دربار سے وابستہ ہوئے، تو اس نے ان کو مخدوم الملک کا خطاب اور شیخ الاسلام کا عہدہ عطا کیا، شریعت کی ترویج میں برابر کوشاں رہے، بہت متعصب سنی تھے، ملحدوں اور شیعوں سے ان کو سخت نفرت تھی، شیر شاہ کے مقابلے میں بدقسمتی سے جب ہمایوں کو شکست ہو گئی اور وہ بھاگ کر ایران چلا گیا تو مولانا عبداللہ سوری خاندان کے حکمرانوں کے دربار سے منسلک ہو گئے، اس زمانہ میں تحریک مہدویت کا بڑا زور تھا، وہ اس کے سخت مخالف تھے، جس پر بھی ان کو مہدویت کا شبہ ہو جاتا تھا، اس کو سزا دیے بغیر نہیں رہتے تھے، سلیم شاہ سوری کے

عہد کے دو جلیل القدر علماء شیخ علائی، اور شیخ نیازی مہدویت کے علم بردار تھے، شیخ علائی کو پکڑ وا کران کو اتنے دُرّے لگوائے کہ وہ جاں بحق ہو گئے، ملا عبدالقادر بدایوانی ان کو اپنی تاریخ میں ''درویش آزار'' سے یاد کرتے ہیں۔

سلیم شاہ مخدوم الملک کی جس قدر عزت کرتا تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے، کہ وہ اور مخدوم الملک ایک ساتھ ایک تنگ گلی میں سے گزر رہے تھے، کہ سامنے سے مست ہاتھی آتا ہوا دکھائی دیا، مخدوم الملک نے جوش وفاداری میں آگے بڑھ کر ہاتھی کو روکنا چاہا، تو سلیم شاہ نے ان کو روک دیا اور کہا مجھ کو آگے بڑھنے دیجئے، اگر میں ہلاک ہو گیا تو میری جرار فوج کے یہ نو لاکھ افغانی میری جگہ پر کر سکتے ہیں اور سلطنت کو انتشار سے بچا سکتے ہیں، لیکن اگر خدانخواستہ آپ جاں بحق ہو گئے تو آپ کے ایسا ہندوستان میں ایک مدت مدید تک عالم پیدا نہ ہو سکے گا۔

ایک مرتبہ وہ دربار میں آئے، تو ان کو اپنے تخت پر بٹھایا، اور موتی کی ایک تسبیح ان کو پیش کی، جس کی قیمت بیس ہزار روپے تھی،

سوری خاندان کا خاتمہ ہو گیا، تو مولانا عبداللہ اکبر کے دربار میں آ گئے، جہاں انہوں نے اپنی علمی فضیلت اور دینی کمالات کی وجہ سے امارت کے ساتھ بڑا جاہ و جلال حاصل کر لیا، ملک کی سیاست میں بھی بڑا عمل دخل ہو گیا، اور اس سلسلہ میں انہوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ گجرات کی فتح تک ان کو بڑا عروج و اقتدار حاصل تھا، ایک مرتبہ انہوں نے شیخ مبارک ناگوری پر مہدوی اور بدعتی ہونے کا الزام رکھ کر اکبر سے ان کی گرفتاری کی بھی اجازت لے لی۔ مگر رفتہ رفتہ جب شیخ مبارک ناگوری اور ان کے لائق لڑکوں ابوالفضل اور فیضی کا رسوخ دربار میں بڑھا، تو مولانا عبداللہ پر زوال آ گیا۔

مولانا ابوالکلام نے اپنی کتاب میں ان کے بعض فقہی میل اور مہدویت کی مخالفت کی بنا پر علمائے سوء میں شمار کیا ہے، اور ان کے عجیب عجیب قصے لکھے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ بایں ہمہ دولت و تمول جو انہوں نے اپنی شیخ الاسلامی کے زمانہ میں حاصل کر رکھا تھا، یہاں تک کہ اپنی خاندانی قبروں میں چاندی سونے کی اینٹیں مدفون کر

دی تھیں، ان کی عمر بھر کبھی زکوٰۃ ادا نہیں کی، زکوٰۃ سے بچنے کے لئے اپنا سارا اندوختہ ہر سال اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیتے تھے اور وہ ایک سال پورا ہونے سے پہلے ان کے نام بخش دیتی، اس طرح حول کامل دونوں میں سے کسی پر نہ گزرتا، کہ ادائے زکوٰۃ کی شرط پر دونوں اترتے، یہی وہ ہمیشہ کرتے، اسی وجہ سے انہوں نے حج بھی نہیں کیا، کہ حج کے فرض ہونے بھی یہی شرط ہے، لیکن جب ان پر زوال آیا، تو ان کو زبردستی حج کے لئے بھیجا گیا بلکہ ان کو وہیں جلاوطن بھی کر دیا گیا۔ لیکن ایک امیر کی سفارش سے ان کو پھر ہندوستان آنے کی اجازت مل گئی، لیکن عمر نے وفا نہیں کی اور انتقال کر گئے، معلوم نہیں ان کی دولت کا کیا حشر ہوا۔

ان کو تحریک مہدویت کے استیصال میں بڑا دخل ہے، اور وہ بالآخر ختم ہو گئی۔ یہاں تک کہ اس کا لٹریچر بھی عام طور سے نہیں ملتا، حیدرآباد سے دو ایک رسالے ان کے متعلق شائع ہوئے ہیں، لیکن وہ اتنے مختصر ہیں کہ ان کو پڑھ کر کوئی تشفی نہیں ہوتی، مولانا نے تو اپنے زمانۂ نظر بندی رانچی میں علمائے سوء کے تذکرہ کے سلسلہ میں ضمناً اس لئے اس پر کسی قدر روشنی ڈالی تھی کہ کوئی صاحب ہمت اس سے آگے بڑھ کر اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں گے، اور اس تحریک کے مالہ و ماعلیہ پر، اس کے تمام لٹریچر کو سامنے رکھ کر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں گے، لیکن افسوس کہ آج تک اس پر ایک حرف کا اضافہ نہ ہو سکا، اور یہ موضوع ابھی تک تشنۂ تحقیق ہے۔ کیا یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کے اسلامیات ریسرچ اسکالر اور ندوہ و دیوبند و مرکزی دارالعلوم بنارس کے فضلاء اس کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں گے۔ اس میں محنت ضرور ہے، لیکن اس سے ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا ایک گوشہ ضرور سامنے آ جائے گا۔ اب تو لوگ ایسے موضوعات قصداً اختیار کرتے ہیں جن میں زیادہ محنت اور مشقت نہ کرنا پڑے، اور پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جائے، اور جہاں بھی ہوں، ان کی ملازمت مستقل ہو جائے، یا وہ سند ان کی ملازمت کا پیش خیمہ ثابت ہوا، کہ اب تو ہر مضمون میں اتنی کثرت سے ایم اے ہونے لگے ہیں کہ ملازمت کے لئے اور خصوصاً کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لازمی قرار دے دی گئی ہے،

یہ مقالے خود تو بہت کم، زیادہ تر دوسرے لوگوں سے پیسہ دے کر لکھوائے جاتے ہیں اور ڈگری حاصل کی جاتی ہے، جس طرح ہر طرح کی تعلیم کا معیار پست ہو گیا ہے۔ اسی طرح اب پی ایچ ڈی کا معیار بھی ضرورت سے زیادہ گر گیا ہے، پھر وہ مقالہ لکھ کر یا لکھوا کر اسی پر قانع ہو جاتے ہیں، اسی موضوع پر یا دوسرے موضوع پر لکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ میں اسے ڈاکٹروں کی زندگی کا بہت بڑا المیہ سمجھتا ہوں، اب تو لوگ موجود عہد تک کے لوگوں پر پی ایچ ڈی کرنے پر اتر آئے ہیں۔ اور یونیورسٹیوں سے ان کو نہایت فیاضی کے ساتھ اجازت مل جاتی ہے، بعض بعض لوگوں نے تو اس لالچ میں اپنی اپنی خودنوشت سوانح عمریاں مرتب کر ڈالی ہیں کہ ان پر ریسرچ کرنے والوں کو زیادہ جدوجہد نہ کرنا پڑے، انہی سوانح عمریوں کو سامنے رکھ کر ان پر مقالے تیار کر لئے جائیں، امید ہے، کہ ناظرین میری اس درازنفسی کو معاف فرمائیں گے۔

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی پہ معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

علامہ شبلی کی مولانا آزاد سے ڈرامائی ملاقات

مولانا ابوالکلام آزادؒ اور علامہ شبلیؒ کی گراں قدر علمی و ادبی و تاریخی تصانیف خصوصاً ان کی مایہ ناز کتاب شعر العجم کے ذریعہ، اپنی طالب علمی کے زمانہ ہی سے واقف ہو گئے تھے، اور خود مولانا شبلی لسان الصدق کلکتہ کے ایڈیٹر کے حیثیت سے ان کو کسی قدر جانتے تھے، لیکن ان دونوں عباقرۂ وقت کی ملاقات اچانک ڈرامائی انداز سے عجائب زار بمبئی میں ہوئی، جس کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا شبلیؒ بمبئی اکثر جایا کرتے تھے، بلکہ اعظم گڑھ اور لکھنو کے بعد ان کا تیسرا مرکز بمبئی ہو گیا تھا، جہاں سال میں ایک مرتبہ وہاں جا کر ایک مہینہ ضرور گزارتے تھے اور کتابوں کا پشتارا بھی ساتھ رہتا تھا، وہ بمبئی کی دلفریبیوں اور دلآویزوں سے بہت مسحور تھے، اور ان کی فارسی غزلیات تمام تر قیام بمبئی ہی کی رہین منت ہیں، وہاں ان کی کشش کے بہت سے اسباب جمع ہو گئے تھے۔ ایک تو وہاں کامل تنہائی نصیب ہو جاتی تھی، جو تصنیف و تالیف اور تحقیق و تلاش میں انہماک کے لئے بہت ضروری ہے، دوسرے ان کو کچھ پارسی دانشور مل گئے تھے، جو فارسی زبان و ادب و تاریخ کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے، جس کے مولانا شروع ہی سے جاندادہ تھے، شعر العجم کے پانچوں حصے ان کے فارسی ادب اور شاعری سے اس والہانہ شیفتگی کا نتیجہ تھے، فردوسی نے اگر شاہنامہ لکھ کر عجم کو زندہ کر دیا تھا، تو مولانا نے شعر العجم لکھ کر خود فردوسی اور اس کی قابل فخر مثنوی

شاہ نامہ کو زندہ کر دیا، فارسی کا جو ذوق امتداد زمانہ سے ختم ہو گیا تھا، اس میں پھر روح پیدا کر دی، اور لوگ فارسی زبان و ادب کی تحصیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

دوسرے وہیں سے قریب ایک ریاست جنجیرہ ہے، جس کو جزیرہ بھی کہتے ہیں، اس کا فرماں روا ایک نواب خاندان تھا، اس خاندان میں بعض خواتین جو اعلیٰ تعلیم یافتہ، یورپ پلٹرن اور شعر و ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتی تھیں، اور بے محابا بڑے بڑے جلسوں میں اسپیچ دیتی تھیں، ان کی بے حد معتقد تھیں، ان میں سے ایک کے شوہر نے ان کی تصویر بھی بنائی تھی، جو اتنی اچھی تھی، کہ پیرس کی آل ورلڈ نمائش کی پکچرس گیلری میں بھی رکھی گئی تھی، جس پر مصور کو اس نمائش کی طرف سے گراں قدر انعام بھی ملا تھا، مولانا نے ان خواتین کو اپنی میزبانی کا بھی شرف بخشا تھا، وہ اپنے ان میزبانوں کے اخلاق، لطف و مدارت، اخلاص و محبت، گرم جوشانہ مہمانداری اور ریاست کی سرسبزی و شادابی و رنگینی اور سبزہ و گل کی فراوانی سے اتنا متاثر ہوئے کہ فی البدیہہ اس کی تعریف میں کئی غزلیں لکھ ڈالیں، جو سب کی سب بے حد دلکش ہیں، ایک غزل میں فرماتے ہیں۔

یاد صحبت ہائے رنگین جو جزیرے میں رہیں
وہ جزیرے کی زمیں تھی یا کوئی مے خانہ تھا
سبزہ و گل سے بھرا تھا دامن کہسار سب
غیرت خلد بریں ہر گوشہ ویرانہ تھا

مولانا نے اپنی بعض تصانیف مثلاً شعر العجم کے بعض حصے یہیں بمبئی میں بیٹھ کر مکمل کیے تھے، بلکہ اپنی زندگی کی آخری اور سب سے اہم اور مقدس کتاب سیرۃ النبی کا آغاز بھی یہیں کیا تھا، لیکن ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور وہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی، ان کی اکثر فارسی غزلیں بھی کنار آب چوپاٹی اور گلگشت اپالو ہی کی رہین منت ہیں، جن کے متعلق مولانا حالی کی رائے ہے کہ غزلیں کا ہے کو ہیں شراب دو آتشہ ہیں۔ جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی ملا ہوا ہے۔ اسی طلسم زار بمبئی میں مولانا اپنی علمی و ادبی ضرورت سے مقیم تھے، کہ ان کو پتہ چلا کہ یہاں ایک بہت ہی حسین و جمیل، خوب رو، خوش ادا، خوش صفات

لڑکا آیا ہوا ہے، جو گوناگوں صلاحیتوں کا مالک ہے، مولانا کو دارالعلوم ندوہ کے لئے جس کے وہ معتمد تعلیم بلکہ روح رواں تھے، جینیس اور غیر معمولی ذہن و دماغ کے لڑکوں کی تلاش رہتی تھی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی جو علی الترتیب پھلواری شریف پٹنہ اور مدرسہ رحمت غازی پور سے ندوہ میں آئے تھے۔ مولانا کی نگہ التفات کے مرکز ہو گئے تھے، اس کے پیش نظر اس عجیب و غریب صفات کے لڑکے سے بھی ملنے کی خواہش پیدا ہوئی، اس کو خود بھی ان کی تلاش تھی، ان کی اکثر تصنیفات کا مطالعہ کر چکا تھا، اور ہر ایک پر اپنی مستقل رائے رکھتا تھا، ایک آدھ مرتبہ خطوط کے ذریعہ نذرانہ عقیدت بھی پیش کر چکا تھا، چنانچہ جب وہ مولانا کی خدمت میں پہنچا، اور مولانا سے ان الفاظ میں اس کا تعارف کرایا گیا کہ یہی لسان الصدق کلکتہ کے اڈیٹر ہیں، ان کا نام ابوالکلام ہے، تو مولانا نے ان کو سر سے پاؤں تک دیکھا، اور فرمایا کہ یہ نہیں ان کے والد ہوں گے، لیکن جب ان کو یقین دلایا گیا، تو ان پر حیرت طاری ہو گئی، اور صاحبزادے کو اپنے دامن تربیت میں لے لیا، کہ یہ بھی آگے چل کر اور لڑکوں کی طرح ملک میں ندوہ کا نام روشن کریں گے، اور ان سے بڑی بڑی توقعات قائم کر لیں، مولانا شبلی نے ان سے ندوہ چلنے کے لئے کہا تو وہ فوراً راضی ہو گئے لیکن مولانا ان کو ندوہ کا پیغام دے کر خود کسی فوری ضرورت سے لکھنؤ چلے آئے، اور پھر وہاں سے اعظم گڑھ، مولانا ابوالکلام جن کو مولانا کی صحبت میں کچھ دن گزارنے اور ان سے براہ راست استفادہ و استفاضہ کی بڑی تمنا تھی، ایک آدھ ہفتہ کے بعد عازم لکھنؤ ہوئے، لکھنؤ پہنچے تو معلوم ہوا، کہ مولانا اپنے وطن اعظم گڑھ تشریف لے گئے ہیں، وہ سیدھے اعظم گڑھ چلے آئے، جہاں وہ مولانا شبلی کے ساتھ دو ایک دن رہے پھر انہی کے ساتھ لکھنؤ آئے، اس وقت ندوہ شہر کے کسی کرایہ کے مکان میں تھا، اور اسی کے قریب مولانا ایک مکان میں رہتے تھے، جس کی اب تاریخی حیثیت ہو گئی ہے، جس کو خاتون منزل کہتے ہیں یہ اب مولانا عبدالماجد دریابادی کی مستقل قیام گاہ ہے۔ ندوہ کے طلبہ کو جب معلوم ہوا کہ کوئی ہونہار لڑکا بمبئی سے آکر مولانا کے یہاں مقیم ہے تو اس کو دیکھنے کے لئے پورا ندوہ امنڈ پڑا۔ ان طلبہ میں مولانا مسعود علی ندوی بھی تھے، جو بعد میں

دارالمصنفین اعظم گڑھ جیسے عالمی تصنیفی ادارہ کے بہت کامیاب اور نامور منتظم ثابت ہوئے اور دارالمصنفین کو اپنے حسن انتظام سے معراج کمال پر پہنچا دیا اور چاردانگ عالم میں اس کی شہرت ہوگئی، انہوں نے مولانا سے پوچھا کہ یہ ندوہ میں پڑھنے کے لئے آئے ہیں، مولانا نے جواب دیا، یہ طالب علم نہیں ہیں۔ یہ پڑھ کر آئے ہیں، انہوں نے تمام درسی علوم کی تکمیل اپنے والد مولانا خیرالدین اور ان کے مقرر کردہ اساتذہ سے کرلی ہے۔ یہ صرف مجھ سے استفادے کے لئے آئے ہیں، یہ پورے عالم ہیں، اور تعلیم سے فارغ ہو گئے ہیں تو اس سن و سال میں مولانا شبلی کی زبان سے ان کے یہ کمالات سن کر تمام طلبہ حیرت میں آ گئے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی فطری اور ذہنی صلاحیتوں کی بنا پر ندوۃ العلماء کے علمی آرگن ''الندوہ'' کی سب ایڈیٹری سونپ دی گئی، جو مولانا شبلیؒ اور ان کے ہم مذاق دوست مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی مشترکہ ادارت میں نکلتا تھا، جس کے اعلیٰ علمی وتنقیدی وتاریخی مضامین کے سارے ملک میں دھوم تھی اور علماء کی بارگاہ میں جس کو بڑا اعتبار حاصل تھا، اس گراں قدر خدمت کو اس کم سنی میں مولانا ابوالکلام نے چھ مہینے تک بڑی خوبی اور سلیقہ مندی سے انجام دیا۔ اور ان کے رشحات قلم پر ارباب نظر کی نگاہیں پڑنے لگیں، ملک کے مشہور صاحب طرز انشاء پرداز، مہدی افادی الاقتصادی نے ان کے ایک مضمون سے متاثر ہوکر مولانا شبلیؒ سے ان کے متعلق دریافت کیا، تو لکھتے ہیں۔

''آزاد کو تو آپ نے مخزن وغیرہ میں دیکھا ہوگا، قلم وہی ہے، معلومات یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں''

فرید وجدی کی معرکۃ الآرا کتاب المرأۃ المسلمہ پر ان کا تبصرہ اسی زمانہ کا ہے، جس سے ان کے ملک کے اعلیٰ علمی حلقوں تک شہرت ہوگئی، یہ مضمون بعد میں ''مسلمان عورت'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے، الندوہ کی ترتیب وایڈیٹنگ کے لئے اس فاضل نوجوان پر مولانا کا اس درجہ اعتماد بعض لوگوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا اور چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا ابوالکلام چھ ہی مہینہ کے بعد مولانا شبلی کی فیض بخش صحبت اور الندوہ کی سب ایڈیٹری کی پروقار خدمت چھوڑ کر روزنامہ وکیل

امرتسر میں چلے گئے۔

اس مختصر مدت میں مولانا شبلی سے ان کو جو عقیدت پیدا ہوگئی تھی، اس علیحدگی اور جدائی کے بعد بھی قائم رہی۔ مولانا کے دم واپسیں تک انہی کا کلمہ پڑھتے رہے اور ندوہ کے اختلافات میں تو انہوں نے مولانا کا پورا ساتھ دیا اور ان کی حمایت کے لئے الہلال کے صفحات وقف کر دیے۔ مولانا شبلیؒ نے بھی ان کے نیاز مندانہ وعقیدت مندانہ تعلق کو فراموش نہیں کیا اور ان سے برابر تعلقات قائم رکھے، ان سے خط وکتابت بھی تھی، جو مولانا شبلیؒ کی زندگی کے آخر تک قائم رہی، مولانا نے اپنے مرض الموت میں اپنی زندگی کی آخری کتاب سیرت کی تکمیل کے لئے جن تین آدمیوں کو تار دے کر بلوایا تھا، ان میں ایک مولانا ابوالکلام بھی تھے، لیکن ان کو تار نہیں مل سکا اور وہ نہ آ سکے، اور اس سلسلہ میں ان سے ملاقات اور سیرت کے متعلق کسی وصیت کی حسرت وہ اپنے ساتھ لے گئے، اگر وہ آ جاتے تو ظاہر ہے ان سے بھی وہی ارشاد فرماتے، جو مولانا فراہی اور مولانا سید سلیمان ندوی سے ارشاد فرما گئے، مولانا کے انتقال کے بعد ان کے تلامذہ نے مولانا فراہی کی راہنمائی میں انہی کے منصوبہ کے مطابق دارالمصنفین اعظم گڑھ میں قائم کیا، تو اس سے بھی انہوں نے ویسے ہی مخلصانہ اور ہمدردانہ تعلق قائم رکھا، جیسا کہ ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے، جو انہوں نے دارالمصنفین کے قیام کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھے، بلکہ اس ادارہ کی معمولی سے معمولی خدمت کے لئے تیار ہو گئے تھے، جب ایک زمانہ میں آمدنی کی کمی سے اس کا مالی توازن قائم نہیں رہا، تو وزارت تعلیم کی طرف سے ساٹھ ہزار کی گرانقدر رقم سے اس کی مدد کی اور جب تک زندہ رہے اس کا برابر خیال رکھا، اور اس کو اخلاقی مدد پہنچاتے رہے، اسی طرح ملک کے دوسرے نامور ادیب، مصنف اور شاعر مولانا حالی سے بھی ان کی ڈرامائی ملاقات انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جلسہ ۱۹۰۴ء کے موقع پر مولانا سلیم پانی پتی کے توسط سے لاہور میں ہوئی تھی، ان کو بھی کس طرح یقین نہیں آتا تھا کہ یہ لسان الصدق کلکتہ کے اڈیٹر مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، لیکن ان کو جب یقین دلایا گیا، تو اس کمسنی میں ان کے لکھنے پڑھنے کے غیر معمولی کمالات دیکھ کر مبہوت ہو گئے،

انہوں نے مولانا حالی کی مشہور کتاب حیات جاوید علی گڑھ سے منگوا کر اس پر لسان الصدق میں تبصرہ بھی لکھا تھا، اس کتاب کو پڑھ کر وہ سرسید کی عقلیت پسندی کی طرف مائل اور ان کے بڑے مداح ہو گئے تھے، لیکن ان کا یہ تاثر بہت عارضی تھا پھر رفتہ رفتہ وہ سرسید کے بڑے مخالف ہو گئے، اور ان پر نکتہ چینی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اس میں مولانا شبلی کے فیض صحبت کو بھی بڑا دخل تھا جو سرسید کے علم و فضل کے بہت زیادہ قائم نہیں تھے، اور ان پر علی گڑھ کے زمانۂ تعلق ہی میں تنقید شروع کر دی تھی۔ اور سرسید سے الگ اپنی راہ بنائی تھی، جس کے سب سے بڑے موید مولانا ابوالکلام آزادؒ تھے۔ انہوں نے اپنے روزِ قلم سے سے علامہ شبلی کے مشن کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، بلکہ ان کے سامنے ان کے تمام معاصرین کا چراغ گل کر دیا۔ مدرسۂ فیض عام کانپور کے دوسرے جلسہ دستار بندی کے موقع پر ندوہ العلماء کا جو پہلا باقاعدہ اجلاس مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کی صدارت میں ہوا تھا اس میں مختلف مکاتب فکر کے بڑے بڑے علماء اور ارباب درس تدریس شریک تھے، لیکن ان سب میں سے سوائے مولانا شبلی کے آج کس کو دنیا جانتی ہے، خود مولانا محمد علی مونگیری سے جو اس کے پہلے ناظم، ردِ نصاریٰ میں متعدد کتابوں کے مصنف اور صاحب رشد و ہدایت تھے، کتنے لوگ واقف ہیں ان پر ایک مستقل کتاب لکھی گئی ہے، جس میں ثابت کیا گیا ہے، کہ ندوہ العلماء کا تصور سب سے پہلے انہی کے دل میں پیدا ہوا تھا اور وہی ندوہ کے بانی ہیں۔ مگر ہزار کوشش کے باوجود بھی کون اس کے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے، ندوہ کی تاریخ سے مولانا شبلیؒ کی وابستگی میں مولانا سید سلیمان ندوی کے بعد سب سے زیادہ ابوالکلام کے سحر نگار قلم کو دخل ہے، جب تک الہلال نکلتا رہا وہ اس کا پروپیگنڈا کرتے رہے، اور جب اپنی آخری عمر میں سیرت نبوی لکھنی شروع کی، تو اس کی طرف سارے ملک کی توجہ انہی نے مبذول کرائی، اور اس کا مقدمہ الہلال میں نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا اور ان کے تعارف کے لیے کلکتہ میں ایک شاندار جلسہ کیا۔

(کانفرنس گزٹ۔ علی گڑھ ۱۵ر جولائی ۱۹۷۵ء)

مولانا شبلی کے نام مولانا آزاد کے چند خطوط

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی زبانی مولانا ابوالکلام کی روایت ہے کہ بمبئی میں ملاقات سے بہت پہلے ان میں اور مولانا شبلی میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اور اسی کے ذریعہ دونوں غائبانہ ایک دوسرے سے متعارف ہو چکے تھے۔ لیکن مولانا شبلی یہ نہیں جانتے تھے کہ جو صاحب کلکتہ سے ان کو خط لکھ رہے تھے، وہ اتنے کمسن یا بالکل صاحبزادے ہوں گے۔ بہرحال براہ راست تعارف سے پہلے مولانا شبلی نے ان کو جو خطوط لکھے تھے، وہ غالباً محفوظ نہیں رہے۔ لیکن ندوہ میں رہنے اور پھر وہاں سے چلے جانے کے بعد، مولانا نے ان کو جو خطوط لکھے، ان کی بڑی تعداد ان کے پاس محفوظ رہ گئی، دارالمصنفین کے قیام کے بعد مولانا سید سلیمان نے مولانا شبلی کے مکاتیب کے جمع و ترتیب کا ارادہ کیا۔ تو مولانا ابوالکلام کو بھی اس کے متعلق لکھا، انہوں نے جواب میں لکھا:

> ''مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے مکاتیب مشکل ہے کہ مل سکیں
> کچھ ملے تو پرائیویٹ یا معاملات ندوہ کے متعلق ہیں، اور ان کی اشاعت
> غیر ضروری''

بہرحال سید صاحب کے اصرار سے مولانا شبلی کے تمام خطوط بتدریج انہوں نے سید صاحب کے حوالے کر دیے، جو مکاتیب شبلی حصہ اول کے دوسرے اڈیشن میں آ گئے

ان کی تعداد اس تار کو لے کر جو مولانا کی وفات سے تین دن پہلے کلکتہ کے پتہ سے سیرت کی تکمیل کے لئے ان کو دیا گیا تھا، ۴۰ ہے، یقیناً اتنے ہی خطوط انہوں نے بھی مولانا شبلی کو ضرور لکھے ہوں۔ لیکن بدقسمتی سے خود ان کے خطوط دو چار سے زیادہ محفوظ نہیں رہے۔ ان میں سے دو تو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام کے خطوط کے ذیل میں غلطی سے معارف میں شائع ہو گئے ہیں۔ اور ایک ابھی نگار لکھنؤ میں شائع ہوا ہے جس میں مولانا ابوالکلام نے ان سے شکایت کی ہے کہ میرے والد کے انتقال کو دس روز ہو گئے۔ اخبارات میں اس کا ذکر بھی آ گیا۔ مگر آپ نے تعزیت کا خط تو درکنار تعزیت کی ایک سطر بھی نہیں لکھی:

دل نے ملا دیں خاک میں سب وضع داریاں
جوں جوں رکے وہ ملنے سے ہم بیشتر ملے

مولانا نے اس شکایت کی تلافی کس طرح کی، اس کا پتا ان کے خطوط کے مجموعے سے نہیں چلتا، لیکن مولانا کی اس کوتاہی سے ان کے جذبہ عقیدت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا، اسی خط میں ہے:

"دل ارادت و عقیدت سے اسی طرح لبریز ہے جیسا پہلے تھا، اور انشاء اللہ ہمیشہ رہے گا"

از طور صلح و عربدہ بیگانہ ام ہنوز
بر آتشے نناختہ پروانہ ام ہنوز

مولانا شبلی، مولانا ابوالکلام سے کہیں زیادہ ان کی طرف سے اپنے خطوں کے جواب کے متمنی و منتظر رہا کرتے تھے، ذرا بھی دیر ہو جاتی تھی۔ تو بے قرار ہو جاتے تھے۔ ایک مرتبہ تو وفور جذبات میں اتنا ہی لکھ کر خط روانہ کر دیا۔

اس قدر ناسی ارباب وفا ہو جانا

ایک مرتبہ اپنے شدید تاثر کا اظہار صرف یہ شعر لکھ کر کیا:

دوسہ روزے است کہ در دیدہ نگرویں عجب است
بہ ثوابے زمن آمد نہ گناہے گاہے

ایک مرتبہ ان کی آمد کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو بے قرار ہو کر لکھتے ہیں۔

دیر ویران سہی کعبہ مرا آباد رہے
یعنی مومن ہوں چلا جاؤں گا یاد رہے

مولانا ابوالکلام کے خط آنے میں سے زیادہ دیر ہو جاتی تھی تو غایت محبت کی بنا پر اس کو ان کی ناراضگی پر محمول کرتے تھے۔ اور اس وجہ سے طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے ان کے دل میں پیدا ہوتے تھے۔ ایک خط میں ان کو لکھتے ہیں:

''مجھ کو ایک بڑی شکایت آپ سے آپ کی تلون مزاجی اور عدم استقلال کی تھی، بارے اس مرتبہ آپ اپنی ناراضگی میں پورے مستقل رہے۔ اور اب تک ہیں''

اس پر اپنے بخت بد کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں:

بخت بد بیں کہ بہ شبلی نہ کند غیر جفا
نیک خوے کہ وفا راز جفاشنا سد

کسی وقت ان کا بدگمان قلب ان سے مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ صرف یہ شعر لکھ کر خط بھیج دیا۔

شراب لطف پرور جام پر کردی و می گفتم
کہ زود آخر شود ایں بادہ ومن درخسار افتم

یہ آپ جو لطف وکرم کی بارش فرما رہے تھے، تو میں کہتا تھا کہ یہ شراب لطف بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اور میں پھر اسی خمار میں مبتلا ہو جاؤں گا یعنی آپ کی بیزاری و بے اعتنائی کا غم دائم و برقرار رہے گا۔

مولانا شبلی اپنے وسیع حلقہ احباب میں جن میں نواب محسن الملک، عمادالملک، سید حسین بلگرامی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا عبداللہ ٹونکی، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواری، جیسی مقدس اور صاحب علم ہستیاں شامل تھیں، سب سے زیادہ تعلق مولانا ابوالکلام سے رکھتے تھے، اور ان سے اپنا کوئی راز چھپاتے نہیں تھے۔ اپنے تمام معاملات میں خواہ وہ قومی ہوں یا ملی، سیاسی ہوں یا علمی، ان کا تعلق علی گڑھ سے ہو یا ندوہ سے، تصنیف و تالیف سے ہو یا تعلیم و تربیت سے، پبلک سے ہو یا حکومت سے سب

سے زیادہ اعتماد انہی پر کرتے تھے۔ سفر میں خواہ وہ کہیں بھی ہوتے تھے ان کو بھولتے نہیں تھے۔ ان کی ذات کے ساتھ اس قدر شغف ہونے کی وجہ سے رہ رہ کر ان کی طرف سے بدگمانیاں پیدا ہوتی تھیں۔ اور وہ بے اختیار ان کی زبان قلم پر آجاتی تھیں۔ لیکن مولانا ابوالکلام ان سے قطعاً متاثر نہیں ہوتے تھے، وہ خود ان سے کبھی بدگمان نہیں ہوئے۔ وہ مولانا کی زندگی کے آخر تک ان کو اپنا مربی، سرپرست اور ہمدرد سمجھتے رہے، ندوہ کے معاملات میں ان کا پورا ساتھ دیا۔ اور ان کی حمایت پر پورے مسلم ہندوستان کو کھڑا کر دیا، مولانا شبلی نے عجم کی مدح اور عباسیوں کی داستان لکھنے کے بعد سیرۃ پیغمبر خاتم ﷺ لکھنی شروع کی تو اس کی اہمیت اور ضرورت پر الہلال میں مضمون لکھا۔ اور مولانا نے اس کا مقدمہ اشاعت کے لئے الہلال میں بھیجا۔ تو اس کو بہت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔ جس کی صدائے بازگشت سے سارا ہندوستان گونج اٹھا اور ہر شخص ان کے اس اہم اور مقدس کام سے واقف ہوگیا۔

مولانا ابوالکلام کا ایک خط ابھی حال میں ملا ہے۔ جو تمام تر رمز و اشارہ میں ہے جس کو کاتب اور مکتوب الیہ کے علاوہ کوئی تیسرا سمجھ نہیں سکتا۔ وہ بجائے لمبے چوڑے القاب و آداب کے جو وہ مولانا شبلی کو لکھا کرتے تھے۔ یعنی یا مولی الکریم یا مولی الجلیل یا آقائے من وغیرہ کے خالص لکھنوی تہذیب میں ''ضعت'' سے شروع ہے۔ خط گو تمام تر ایمائی ہے۔ پھر بھی دلچسپ اور رنگین ہے۔ ارباب ذوق کی ضیافت طبع کے لئے درج ذیل ہے۔ لفافے پر حضرت مولانا شبلی نعمانی مدفیضہ لکھا ہے۔

حضرت مولانا شبلی نعمانی مدفیوضہ

ضعت! میری مصلحت دید تو یہ ہے کہ کہیں نہ جایئے۔ لکھنؤ میں رہیے، حج کی دو صورتیں ہیں، ایک تو للعوام کی بتلاش کعبہ بحر و بر ہا طے می کنند اور دوسرا حج خواص کہ جب ضرورت ہوتی ہے، کعبہ کو طلب کر لیتے ہیں، ''ابراہیم بن ادہم ہر ہر قدم دو رکعت نماز کرد، چوں قریب کعبہ رسید نہ یافت! ندائے غیبی بگوش رسید کہ برائے استقبال رابعہ بصریہ رفتہ''۔ آپ کا درجہ اس سے بلند ہے کہ کعبہ کی تلاش میں دشت پیمائی کریں، ہاں اجرام سماوی کا مطالعہ اور تفکر فی خلق السموات والارض تو گو لکھنؤ میں بیت المقدس جیسی کوئی ٹیلسکوپ اور دوربین نہیں، اس لئے اجرام بعیدہ کا مطالعہ بے عذر، لیکن تاہم اگر علم ہیئت

کے ابتدائی مراتب کی تحقیق منظور ہو تو شہاب ثاقب کے اجزا کی تفرید و تحلیل کیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ باب حرم سے عراقی کی طرح ستا پڑے:

تو برون در چہ کر دی کہ
درون خانہ آئی

میکلوڈ اسٹریٹ، کلکتہ ۱۱-اکتوبر ۱۹۱۰ء

مکاتیب شبلی میں مولانا ابوالکلام کے نام کے سلسلہ خطوط کا ۲۱واں خط جو ۵/ اکتوبر ۱۹۱۰ء کا تحریر کردہ ہے غالباً مولانا ابوالکلام کے اسی مکتوب کے جواب میں ہے۔ مولانا شبلی ہمیشہ خطوط میں باوجود سن و سال کے کافی تفاوت کے ان کو برادر سے مخاطب کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی خطاب کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ اور خط شروع کر دیتے تھے، اس خط میں ان کو برادرم سے مخاطب کیا ہے لکھتے ہیں:

برادرم!
اچھا کہیں نہیں جاؤں گا
بندہ را فرماں نباشد ہر چہ فرمائی برآنم
لیکن کیا شبلی کو رابعہ کا درجہ مل سکتا ہے "لیس الذکر کالانثیٰ" ماسٹر دین محمد وطن گئے تھے اور سخت جانگزا خبر لائے یعنی بدر کامل حیدرآباد سے دلی پہنچ کر غروب ہو گیا۔ مرتبہ ابراہیمی کہاں سے ہاتھ آئے کہ "لا احب الآفلین" کہہ سکوں۔
الہ آباد کی نمائش میں ایک اور اضافہ ہوا۔ یعنی "دیوان فیضی" بھی ہو گا، اور وہ اوائل دسمبر میں پہنچ جائے گا۔ میرے پاس اطلاع آ چکی ہے۔ اس زمانے میں میاں اسحاق کا کتب خانہ معمور ہو گا۔ ورنہ ممکن تھا کہ زیادہ مطالعہ کا موقع ملتا۔ (۱)
تذکرۂ خطاطان اور کنز اللغۃ کا اب تک انتظار ہے۔ شبلی ۵/ اکتوبر ۱۹۱۰ء

مولانا ابوالکلام نے اپنے کسی خط میں یا زبانی موخر الذکر کتابوں کے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، جواب تک پہنچ نہیں سکی تھیں اور مولانا شبلی کو ان کا شدت سے انتظار تھا۔

مولانا ابوالکلام نے کلکتہ سے ۲۰/ اکتوبر ۱۹۱۰ء کو اس کرامت نامہ کا یہ جواب دیا،

"یا مولی الجلیل!

گو رابعہ بصریہ کی جلالت مرتبت کا سید الطائفہ تک کو قرار، اور آپ تو اپنے ظہور

اول میں یہاں تک معترف کہ خدایا این چہ بوالعجی ست کہ مردان عالم را ازاں محروم کنی نصیب ایں پیرزنست لیکن تاہم ''الذکر مثل حظ الانثیین ''اور سردست تو آپ کو اس آیت کے دقائق حل کرنے ہیں کہ

الرجال قوامون علی النساء

ماسٹر دین محمد نہایت وحشت انگیز خبر لائے۔ میں واردات مسرت ونشاط میں شریک نہ تھا۔ مگر اجازت دیجئے کہ ماتم میں بقدر استعداد دست وسینہ حصہ لوں ولا محب الافلین، سرائی مخصوص بامثال ابراہیم ہے، مگر میرے عقیدے میں آپ امت مرحومہ کی اس جماعت ابدال سے کسی طرح کم نہیں جن میں سے ہر فرد چالیس درجہ ابراہیم خلیل اللہ سے مرتبہ میں زائد، بطفیل فیضانِ درجہ محبوبیت محمدیہ، کما ورد فی الحدیث! پس کم از کم آپ کو زبان حال سے ''انی وجهت وجهی للذی فطر السموات والارض حنیفاً'' ضرور کہنا چاہے۔ اور نیز ماانامن مشرکین جونفوس قدسیہ عطیہ توحید سے فیضیاب ہوں۔ انہیں کیا ضرور کہ آلودہ شرک ہوں۔ یہ تو ہم ایسے بت پرستوں کے لیے رہنے دیجیے۔

اس زمانہ کی خیرہ مذاقی دیکھیے کہ دیوان فیضی کا اولین مستحق تو کتب خانہ ندوہ تھا۔ کہ ان چیزوں کا موجودہ عہد میں آپ کے سوا اور کوئی ٹھکانہ نہیں (۲)۔ گورنمنٹ لائبریری الہ آباد میں اس کے دقائق ومحاسن کو سمجھنے والا کون ہے؟ اور یوں ورق گردانی اور عنوان ہائے جلی کو نا فہمانہ دیکھ لینا دوسری بات ہے۔ الہ آباد کی نمائش بازار مصر سے تو کسی طرح فائق نہیں، لیکن جب اس کی نسبت اردو کے ملک التجار نے صاف کہہ دیا کہ

خواہاں نہیں کوئی واں جنس گراں کا

تو پھر نمائش کے خریداروں کی حقیقت معلوم؟ البتہ اس واڑوں روشنی کی حمایت سے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ مقصود بیع وشرا نہیں، بلکہ صرف نمائش ہے، لیکن شاید جناب کو اس پر بھی اعتراض ہو۔

بارہا چاہا کہ اپنی سرگذشت عرض کروں، لیکن مشکل یہ ہے کہ ایک دفتر بے کنار اور پھر۔۔۔اتنے دفتر میں کہیں فصل نہیں، باب نہیں، حیران ہوں کہ کہاں سے عرض کروں، اور کس قدر! ایک قصہ ہوتا تو سنا دیتا۔ میری داستان تو ایک مجموعہ قصص ہے۔ اپنی

کن کن مصیبتوں کو عرض کروں۔

بگشت ما گذار لشکر افتاد

مونس قدیم بخار کی صحبت شبانہ روزی نے عدیم الفرصت کر دیا ہے۔ چند دنوں کے لئے یہ کہیں تشریف لے گئے۔ تو اپنے سلسلہ قصص کا کوئی تازہ ترین افسانہ بالاختصار عرض کردوں گا۔

ازا نجملہ یکے قصہ محمود و ایاز است

کنز العلوم کے لئے شیخ محمد کو کہہ دیا تھا، تعجب ہے نہیں بھیجا، آج ان کو پھر لکھتا ہوں۔ بایں مضمون کہ اگر آپ کے لئے دقت واشکال ہو تو مجھے بھیج دیجئے۔ میں خود بھیج دوں گا۔

دواوین و تذکروں کا خیال رکھیے جب کوئی عمدہ نسخہ ہاتھ آئے، تو مجھے یاد کر لیجئے۔ چاہتا ہوں کہ قدما و متوسطین کے تمام دواوین جمع کرلوں۔ نیز تذکرے، ورنہ مطالعہ کے لئے تو سوسائٹی (۳) میں کافی ہیں۔

جناب کی نئی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ صرف خبر سنی ہے آج کل کوئی پرچہ نہیں منگواتا۔ مولانا ہدایت حسین (مولانا ان کا لقب کا لعلم ہے) لکھنؤ جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مولوی سید عبدالحی صاحب کا تذکرہ علمائے ہند زیر تصنیف دیکھیں کیونکہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا کے لئے لکھنا چاہتے ہیں۔ آپ سے ملیں گے، مولوی صاحب سے کہہ دیجیے کہ دکھلانے میں بخل نہ کریں۔

ابوالکلام

مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور مولانا ابوالکلام آزاد کو قدیم فارسی شعرا کے نادر قلمی دواوین اور تذکروں کے خریدنے، جمع کرنے اور ان کے مطالعے کا یکساں ذوق تھا، مولانا شبلی کی شاہکار تصنیف شعرالعجم ان کے اسی ذوق کا نتیجہ ہے۔ مولانا شروانی نے فارسی شعرا کے قلمی دواوین اور تذکروں کا ایک بڑا ذخیرہ اپنے کتب خانہ حبیب گنج میں اکٹھا کرلیا تھا۔ اور ان کی مطلا و مذہب جلدیں بندھوا کر مختلف قسموں میں ان کو تقسیم کر دیا تھا۔ اب یہ خزانہ علم وادب ان کے صاحب زادہ عبیدالرحمٰن خاں شروانی کے جذبہ فیاضی سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی آزاد لائبریری میں منتقل ہو گیا ہے جس سے

استفادہ اب بہت آسان ہو گیا ہے۔ مولانا آزاد کو فارسی شعرا کے جو ہزاروں اور لاکھوں اشعار نوک زبان تھے۔ اور جن کو وہ قدم قدم پر اپنے مضامین، تراجم، خطوط اور تحریروں میں برجستہ استعمال کرتے تھے، وہ انہی دواوین اور تذکروں کے مطالعے کا فیض تھا۔ ان کو اس کا ذوق بدوِ شعور ہی سے تھا اور یہی ان کو کھینچ کھینچ کر ولزلی اسٹریٹ کلکتہ میں خدا بخش نامی ایک کتب فروش کی دکان پر لے جاتا تھا۔ جہاں وہ بیٹھ کر فارسی شعراء کے دواوین، تذکرے اور دوسرے فنون کی قلمی کتابیں اور مسودے دیکھا کرتے تھے۔ یہیں ان کو راگ درپن نام کی ایک قلمی کتاب جو فن موسیقی میں تھی، ملی تھی۔ جس کا ذکر انہوں نے غبار خاطر کے آخری خط میں جو موسیقی ہی سے متعلق ہے۔ بڑی تفصیل سے کیا ہے، اس لئے نمائش الہ آباد میں دیوان فیضی کے کسی نادر نسخہ کے آنے کی خبر سے ان کو قدرتی طور پر جو مسرت ہوئی ہوگی، ظاہر ہے، لیکن اپنی قدامت، اہمیت، ندرت، پاکیزگی وطرفگی وغیرہ کے لحاظ سے جتنی قدر و عظمت کا وہ مستحق تھا۔ اس کے نہ ہو سکنے کا اسی کے ساتھ افسوس بھی ہوا کہ ان کے نزدیک گنجینہ شعر و سخن کے اس جوہر گراں ارز کا کوئی اگر مستحق ہو سکتا تھا، تو وہ مولانا شبلی تھے اور اس کی اصلی جگہ بجائے گورنمنٹ لائبریری الہ آباد کے جہاں اس کے دقائق و محاسن کو سمجھنے والا کوئی مشکل ہی سے مل سکتا تھا۔ ندوہ کا کتب خانہ تھا۔ جس کے بانی اور سرپرست مولانا شبلی تھے۔ زمانے کی اس خیرہ مذاقی پر وہ دست حیرت مل کر رہ گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ دیوان فیضی کا یہ نادر قلمی نسخہ آیا تھا تو کسی قدرداں کے یہاں سے، لیکن بعد میں وہ زینت بن گیا گورنمنٹ لائبریری الہ آباد کا۔ جہاں اس کی صحیح قدر دانی کا بہ ظاہر مولانا کے نزدیک کوئی امکان نہیں تھا۔

معلوم نہیں الہ آباد کی نمائش میں شرکت اور پھر دیوان فیضی کے اس نادر نسخہ کے دیکھنے اور مطالعہ کا ان کو موقع ملا یا نہیں، ان کے معلومہ سوانح حیات سے ابھی تک اس کا ثبوت نہیں مل سکا ہے۔ الہ آباد کی یہ نمائش جو ۱۹۱۲ء میں ہوئی تھی (۴) اپنی قدرت اور نوعیت کے لحاظ سے بے مثال تھی۔ اس میں دنیا بھر کی نادر اور عجوبہ روزگار چیزیں اکٹھا کی گئی تھیں۔ جن کی یاد لوگوں کو اب تک باقی ہے۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس میں علمی کشش بھی پیدا کی گئی تھی۔ اور فارسی کی نادر قلمی کتابوں کی نمائش کا بھی ایک شعبہ تھا۔ تاکہ خالص علمی

ذادبی مذاق کے لوگ بھی اس نمائش کو دیکھ سکیں۔اور اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔اسی شعبہ کی وجہ سے مولانا شبلی نے نمائش دیکھنے کے لئے مولانا ابوالکلام کو دعوت دی تھی اور مزید ترغیب و تشویق کے لئے دیوان فیضی کا تذکرہ کیا تھا، جس پر مولانا ابوالکلام نے ان کو لکھا تھا کہ:

''اول تو میں اب کلکتہ سے کہاں نکلتا ہوں، لیکن نمائش الہ آباد کا ضعیف سا خیال ہے۔مگر مسئلہ قیام پیش نظر! الہ آباد میں میری کسی سے ایسی ملاقات نہیں کہ اپنا بوجھ ڈالوں۔ایک دو بار مسٹر اسحاق (مولانا شبلی کے چھوٹے چہیتے بھائی جو الہ آباد میں وکالت کرتے تھے) کے یہاں ٹھہرا، مگر برسم طفیلی کہ جب آپ کہیں ٹھریں گے، تو آپ کے خدام و وابستگان بھی لامحالہ وہیں ٹھہریں گے۔میں بھی ایک چاکر گستاخ تھا، ٹھہر گیا''

لیکن ظاہر ہے کہ مولانا شبلی کی موجودگی میں کاشانہ اسحٰق کے علاوہ اور کہاں وہ ٹھہر سکتے تھے۔اور پھر مولانا شبلی اس کو کیسے پسند کر سکتے تھے۔

حواشی:

(ا) دیوان فیضی سے مراد واقعتاً دیوان کا کوئی مخطوطہ نہیں، عطیہ فیضی کے لیے استعارہ ہے جو الہ آباد کی نمائش دیکھنے آ رہی تھیں۔حضرت علامہ شبلی کو ان سے تعلق خاطر تھا۔ابوالکلام اس راز سے واقف تھے، علامہ شبلی کو ان پر اعتماد بھی تھا۔انھیں یہی خوشخبری سناتے ہیں اور الہ آباد کے سفر کی ترغیب دیتے ہیں۔اسحاق شبلی کے چھوٹے بھائی الہ آباد میں مقیم تھے اور ہائی کورٹ کے پریکٹیشنر تھے۔انھیں کے گھر عطیہ فیضی کو ٹھہرانا چاہتے تھے۔گھر کے ماحول میں زیادہ خلوت میسر نہ آ سکتی تھی اور نہ شوق کی فراوانی کی حد تک لطفِ صحبت اٹھا سکتے تھے۔

دیوان فیضی واقعی کوئی مخطوطہ ہوتا تو وہ نمائش میں کسی شوکیس کی زینت ہوتا۔کم یا زیادہ مطالعے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔صرف زیارت ہو سکتی تھی۔میاں اسحاق کے گھر کے معمور ہونے کا افسوس اور ''زیادہ مطالعے کا موقع'' نہ ہونے کا رنج اسی لیے تھا۔ابوالکلام نے اس خط کا جو جواب دیا ہے۔اس سے یہ حقیقت اور واضح ہو جاتی ہے۔نصف خط اس معاملے کے تذکرے میں قرآن، حدیث سے نظائر و امثال اور استفادہ و اشارہ و کنایہ سے پر ہے۔ذرا غور کیجیے تو شبلی کے ذوق و

سیرت کی پوری داستان نظروں میں گھوم جاتی ہے۔

(۲) کتب خانہ ندوہ کا استعارہ شبلی کے عشرت کدے کے لیے ہے۔ جیسے کہ میاں اسحاق کا کتب خانہ سے خود فاضل مضمون نگار نے ان کا گھر اور کاشانہ ہی مراد لیا ہے۔

(۳) سوسائٹی سے مراد "ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال" اور مقصود اصلی اس کا کتب خانہ ہے۔

(۴) مجھے یقین ہے کہ ۱۹۱۲ء مضمون نگار کا سہو قلم ہے۔ نومبر کے آخر میں یا دسمبر کے آغاز میں نمایش کا انعقاد کا ذکر حضرت علامہ نے ۱۵/ اکتوبر ۱۹۱۰ء کے خط میں کیا ہے اور اس کے جواب از ابوالکلام پر ۲۰/ اکتوبر کی تاریخ درج ہے۔ انسب یہی ہے کہ ۱۹۱۰ء کے دسمبر میں نمایش کا انعقاد ہوا ہوگا۔ (ا۔س۔ش)

مولانا ابوالکلام آزاد
اور
مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

یوں تو مولانا ابوالکلام کے حلقۂ احباب میں وقت کے بڑے بڑے مشاہیر علم و ادب تھے۔ جن میں حالی بھی تھے، شبلی بھی تھے، ڈپٹی نذیر احمد بھی تھے، ان کے علاوہ اور بھی بہت سے علماء وفضلاء اور ارباب علم ودانش تھے، ان میں بھی سب سے زیادہ فکر وذوقی ہم آہنگی ان کو مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے تھی، مولانا شروانی فارسی واردو کا بڑا صاف ستھرا مذاق رکھتے تھے، فارسی شعراء کے دواوین اور ان کے تذکروں کے جمع کرنے کا ان کو بڑا شوق تھا، یہی ذوق مولانا ابوالکلام کو بھی تھا وہ برابر ان کی تلاش میں رہتے تھے، اور ان کو مطالعہ کرتے تھے، اس طرح فارسی کے تمام اساتذۂ سخن کے بہترین اشعار ان کے نوک زبان تھے، اور اپنی تحریروں میں استعمال کرتے تھے، اس ہم ذوقی نے دونوں بزرگوں کو ذہنی طور پر ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا،

مولانا شروانی تو ان دواوین اور تذکروں کی مطلاّ و مذہب جلدیں بھی بندھواتے تھے۔ اس طرح سے ان کے پاس ایک اچھا خاصا کتب خانہ جمع ہو گیا تھا، کوئی ان کا کتب خانہ دیکھنے آتا تھا، تو اس کو اپنے کتب خانہ کے نوادرات خاص طور سے دکھاتے تھے اور ان کے اپنے اس کتب خانہ تک پہنچنے کی پوری تاریخ بیان کرتے تھے، اسی کے ساتھ اردو کے بہت اچھے مضمون نگار اور شاعر بھی تھے، اردو فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے، اور حسرت تخلص کرتے تھے، بعد میں متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہو

گئے تھے، جن میں سیرۃ الصدیق، علمائے سلف اور نابینا علماء بہت مشہور ہیں، اللہ تعالیٰ نے فضل و کمال کے ساتھ دولت و امارت اور حسن و جمال سے بھی نوازا تھا، کتابوں کا مطالعہ، مضمون نگاری اور شاعری ان کی زندگی کے مشہور مشاغل تھے، مولانا ابوالکلام سے ہم آہنگی، علم و ادب کے دائرہ ہی تک تھی۔ سیاسیات میں مولانا ابوالکلام کی جو راہ تھی، وہ اس سے آشنا تک نہ تھے، اور نہ وہ اہل علم کا سیاست کے خارزار میں پڑھنا پسند کرتے، وہ دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کے صدر تھے، وہاں کے رفقاء و مصنفین کی نگرانی اور تربیت انہی کے متعلق تھی، اور وہ ان کے غیر علمی مشاغل پر بڑی کڑی نگاہ رکھتے تھے، جہاں کوئی بازار سیاست میں نکلا، اس کو کھینچ کر انہوں نے دارالمصنفین کے زاویۂ علم میں پہنچا دیا، مولانا سید سلیمان ندوی کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کی ممبری تک پہنچ کر یکایک ملک کی سیاسیات سے جو الگ ہو گئے، اس میں بہت زیادہ دخل مولانا شروانی کے ایماء ہی کا تھا اور پھر زندگی بھر اس کے قریب نہیں گئے، اور دارالمصنفین کے زاویۂ عزلت میں بیٹھ کر بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیے، مولانا مسعود ہی دارالمصنفین کے انتظامی شعبہ کے نگران تھے اور علم و فن سے زیادہ قومی و سیاسی و ملی کاموں کا ذوق رکھتے تھے، اور انہوں نے اپنی علمی سرگرمیوں سے وقت کے بڑے بڑے لیڈروں کا اعتماد بھی حاصل کر لیا تھا، لیکن مولانا شروانی نے ان کو بھی اس سے روکا، اور ان کی ساری سرگرمیاں ختم ہو گئیں، جب تک زندہ رہے، عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا، دور کے تماشائی ضرور تھے، لیکن وہ مولانا ابوالکلام پر اس طرح کا کوئی اثر نہیں ڈال سکے، نہ وہ خود ان کا اثر قبول کر سکے، لیکن قومی و سیاسی نظریات میں مختلف ہونے کے باوجود ان میں بڑا دلی ربط و اتحاد تھا، قلعہ احمد نگر جیل کی تنہائیوں میں ان کے تمام احباب میں ان کے یہی ہم ذوق بزرگ دوست یاد آتے، اور انہی کو عالم خیال میں مخاطب کر کے، خطوں کے لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا، اگر اس درمیان میں ان کی محبوب بیگم زلیخا بی بی کی کلکتہ میں شدید علالت اور اسی زمانۂ اسارت میں ان کی وفات کا حادثہ جس نے ان کی زندگی کا سارا نشاط ختم کر دیا، نہ پیش آ جاتا، تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کب تک قائم رہتا، اور اس طرح کے کتنے خطوط ضبط تحریر میں آ جاتے،

پھر یا تو غبار خاطر اور زیادہ ضخیم ہو جاتا، یا مکاتیب شبلی کی طرح اس کی دو یا دو سے زیادہ جلدیں بنانا پڑتیں، ان کو خطوط پر، ادبی مضامین کا، انشائیہ کا، خودنوشت سوانح عمری کا، غرض ادب کی ہر صنف کا اطلاق ہو سکتا ہے، جس نقطہ نظر سے بھی لوگوں نے اس کا جائزہ لیا، ایسا ہی ان کو نظر آیا، ان پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اردو ادب کی تاریخ میں اس کو انانیتی ادب کا شاہکار بھی قرار دیا گیا، اور اس میں مضامین اور کتابیں لکھی گئیں، ان کے پیش رو ایک غالب بھی تھے، جو اپنے معاصرین میں کسی کو بھی اپنے مقابلے میں خاطر میں نہیں لاتے تھے اور اپنے کو فارسی زبان وادب کا بڑا اعلام اور شاعر سمجھتے تھے، اسی درجہ کا انا مولانا ابوالکلام میں بھی تھا، جب تک زندہ رہے، اپنے فضل و کمال کے آگے کسی کو بھی خاطر میں نہیں لائے اور ساری دنیا سے بے نیاز رہے، ان کے خلاف کیا کیا فتنے نہیں اٹھے لیکن انہوں نے ذرہ برابر بھی اس کی پروانہیں کی، اول دن سے اپنی زندگی کی جو راہ متعین کر لی تھی، اسی پر زندگی بھر پوری استقامت کے ساتھ گامزن رہے۔

مولانا خدا بخش مرحوم
اور
صحیفہ الہلال، کلکتہ

مولانا ابوالکلام آزاد جس طرح اور بہت سے اوصاف میں منفرد تھے، اسی طرح اپنے اسلوب تحریر کے اعتبار سے بھی یگانہ تھے، جو نہ صرف وہبی اور خداداد تھا، بلکہ اس وقت جتنے اسالیب تحریر اردو میں رائج تھے، اور جن کا تتبع ہو رہا تھا، اور جن میں وقت کی بڑی بڑی تصنیفات تھیں، ان سب سے الگ تھا، جس کے وہ خود خلاق تھے، جس کا کوئی بھی ہزار کوشش کے باوجود تتبع نہ کر سکا۔ اس میں بیک وقت آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی سب کی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں، اس میں شبلی کا زور تھا، حالی کی سادگی تھی، نذیر کا بانکپن تھا، محمد حسین آزاد کی رنگینی تھی اور اس پر مستزاد قرآن و حدیث سے استدلال و استشہاد تھا، وہ جو چیز بھی پیش کرتے تھے، قرآن کی روشنی میں پیش کرتے تھے، اس میں ایسا سحر تھا، کہ جو بھی پڑھتا تھا اس سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات جس پر اب تک کسی کی نظر نہیں پڑی یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام ایک داعی مذہب، عالم دین، اور مفسر قرآن کی حیثیت سے منظر عام پر آئے تھے، لیکن انہوں نے جو اخبار نکالا، وہ وقت کے تمام اخبارات و رسائل سے بالکل مختلف، جس کے ہر نمبر میں پورے التزام کے ساتھ تصویریں ہوتی تھیں، غازیانِ اسلام کی بھی، اور فنون لطیفہ کے ماہرین کی بھی، مردوں کی بھی اور عورتوں کی بھی، جو یکسر اسلام کی تعلیمات و ہدایات کے منافی سمجھی جاتی تھیں، لیکن لوگوں کا خیال تصویروں کے جواز اور

عدم جواز کی طرف نہیں گیا، بلکہ قرآن وحدیث کے رنگ میں جو چیز بھی اس کے صفحات میں پیش کی جارہی تھی، اسی کی طرف تمام لوگوں کی توجہ مبذول ہوگئی، اس میں بیک وقت ہرقسم کی تصویریں بھی شامل ہوتی تھیں، جن کی کسی حالت میں اسلام اجازت نہیں دے سکتا تھا، اور تفسیری نکات وغوامض بھی، یہ بھی ابوالکلام کا اعجاز تھا۔ کسی حلقہ سے بھی یہ آواز نہیں اٹھی کہ قرآن وحدیث کو یکسر حرام چیز کے ساتھ کیوں ملوث کیا جارہا ہے، حالانکہ اس کے پڑھنے والوں میں رندان قدح خوار بھی تھے اور وقت کے زہاد واتقیا بھی۔ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب جیسے بزرگانِ علم اور فقیہانِ دین بھی! وہ بھی تھے جو محرمات و محظورات ومنکرات تو الگ رہے بدعات ومحدثات تک برداشت نہیں کر سکتے تھے، لیکن اس بدعت کی طرف جو حرام کے درجہ پر سمجھی جاتی تھی کسی کا خیال تک نہیں گیا، اور جب تک وہ نکلتا رہا، مصور اور رنگین ہی نکلتا رہا اور آخر آخر تک مقبول رہا۔ اس پر تقریباً پون صدی کا طویل زمانہ گزر گیا، پھر بھی وہ مقبول ہے اور شائقین اسے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں، ابھی کچھ عرصہ ہوا پاکستان میں اس کے ایک قدر دان ناشر نے اس کی پوری اشاعت کا عکسی فوٹو لے کر نہایت اہتمام سے چھاپا ہے، یہ قدر دانی کی انتہا ہے اور وہاں چھاپا گیا ہے، جس کے تصور کے مولانا آخر آخر تک مخالف رہے اور اس کو مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے رہے۔

میرے ایک ہشتاد سالہ استاد تھے، مولانا خدا بخش صاحب مرحوم، عربی کے فاضل، فارسی ادبیات کے ادا شناس اور ان دونوں زبانوں کے بہت اچھے مدرس، زاہد شب زندہ دار، صائم الدہر و قائم اللیل، دن روزہ سے گزرتا تھا اور رات ذکر وعبادت اور سجود وتلاوت میں! منہیات سے اس قدر مجتنب کہ اللہ اللہ ان کے ذہن میں کسی ارتکاب کا تصور بھی نہ آیا ہوگا، یکے از اہل حدیث قاضی محمد مچھلی شہری کے شاگرد وضع ولباس انتہائی مولویانہ اور متقیانہ، سر پر گول سفید میرٹھی ٹوپی، گلے میں تکمہ دار ململ کا کرتہ، جس کا گریبان ہمیشہ کھلا رہتا تھا، ٹانگوں میں ٹخنہ سے ایک بالشت اونچا عربی کٹ پائجامہ، جاڑوں میں موزوں پر چمڑے کا جراب استعمال کرتے تھے، معمولی بدعت تک برداشت نہیں کر سکتے

تھے، رمضان شریف میں شبینہ یعنی ایک رات میں پورا قرآن ختم کرنے کے سخت مخالف تھے۔ فرماتے تھے کہ تین دن سے کم میں قرآن ختم کرنے کی شریعت نے اجازت ہی نہیں دی ہے۔ کچھ لوگوں نے دو رات میں قرآن ختم کرنے کے متعلق دریافت کیا، تو اس کو بھی پسند نہیں کیا، فرمایا یہ بھی جائز نہیں ہے، اعظم گڑھ کی جامع مسجد اہل حدیث کے مستقل امام، خطیب اور پورے شہر کے مفتی تھے، دوسرے مسلک کے لوگ بھی ان پر اعتبار کرتے تھے، اور ان سے مسئلے پوچھتے تھے، انہی کے ایک فتویٰ کے مطابق اعظم گڑھ میں نابالغ حفاظ کی اقتداء میں تراویح کی نماز پڑھنے کا رواج ہوا، اور آج تک جاری ہے، آخر عمر میں بالکل گراں گوش ہو گئے تھے، پھر بھی تعلیم و تدریس کا سلسلہ جاری تھا، بچوں کو ان کی کتابیں گھٹنوں پر رکھ کر پڑھاتے تھے، میں نے ان سے ان کی گراں گوشی ہی کے زمانہ میں فارسی و عربی کی ابتدائی کتابیں میزان، منشعب، شرح مأۃ عامل، علم الصیغہ وغیرہ پڑھی تھیں، ان کے شاگردوں میں مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری بھی تھے، ابتدائی تعلیم انہوں نے اعظم گڑھ میں آ کر انہی سے حاصل کی تھی، ان کے ہم درس میرے والد مرحوم بھی تھے، ان کے ایک جلیل القدر شاگرد سعید انصاری ایم، اے کولمبیا یونیورسٹی اور سابق پرنسپل ٹریننگ کالج جامعہ ملیہ بھی تھے، جن کا ابھی دو سال پہلے دہلی میں انتقال ہوا ہے۔(۱) نیک اور تعلیم کے بڑے ماہر تھے، ایک شہر کے بہت ہی مقبول حکیم اسحاق صاحب تھے، ایک حافظ یٰسین برق تھے، جو حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کے عزیز اور مدرسہ احمدیہ آرہ کے فاضل تھے، بڑے ذہین، طباع اور شاعر۔ مولوی صاحب کا ذریعہ اظہار خیال بجائے اردو کے فارسی تھا۔ اپنے پڑھے لکھے احباب اور معاصرین کو فارسی ہی میں خطوط لکھتے تھے، اپنے صاحبزادے مولوی اسلم صاحب کو ڈسٹرکٹ بورڈ اعظم گڑھ میں ملازمت کے لئے اس کے سیکرٹری جناب ڈپٹی ابو محمد صاحب کو فارسی میں درخواست دی تھی، جس سے وہ اتنا متاثر ہوئے کہ جب تک وہ اعظم گڑھ میں رہے، برابر ان کی ملاقات کے لئے مدرسہ میں آتے تھے، اور ان کا بہت ہی ادب و احترام کرتے تھے۔

شہر کے انہی جامع الصفات بزرگ، مفتی اعظم، جماعت اہل حدیث کے امام،

قامع بدعات، داعی کتاب وسنت، عامل بالحدیث، اور ایک دینی مدرسہ کے صدر مدرس کے پاس مولانا ابوالکلام آزاد کا یہی مصور اور رنگین الہلال ڈاک سے آتا تھا، تو اس کو ڈاکیے کے ہاتھ سے اس طرح ذوق وشوق کے ساتھ لیتے تھے، کہ گویا حضرت جبرئیل ان کے پاس صحیفہ آسمانی لے کر آئے ہیں، درس وتدریس چھوڑ کر اس کے مطالعہ میں محو ہو جاتے تھے اور جب تک اس کا ایک ایک حرف پڑھ نہیں لیتے تھے، کسی کو دیتے نہیں تھے، نہ ان کے دوران مطالعہ میں ان سے مانگنے کی کوئی جرأت کرسکتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے اعظم گڑھ ہی کے ایک لائق اور پڑھنے لکھنے کے بہت شوقین شاگرد مولوی عبدالحق صاحب اویسی نے جو عربی کے منتہی طالب علم تھے، اور بعد میں مولانا کفایت اللہ دہلوی کے مدرسہ امینیہ دہلی میں جاکر اس کی تکمیل کی تھی، ان سے اس کے مطالعہ کے شوق کا اظہار کیا، تو آپے سے باہر ہو گئے، فرمایا کہ تم کیا، تمہارے باپ بھی اس کو نہیں سمجھ سکتے، اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اس کی معرب اور آیات واحادیث وآثار سے مزین اردو اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں سمجھ سکتے تھے، جس کے موجد مولانا ابوالکلام تھے، اور انہی کی ذات پر یہ اسلوب ختم بھی ہو گیا، کوئی بھی اس کا تتبع نہیں کرسکا۔ ہر کسی کے لئے اس کا سمجھنا مشکل تھا۔

مولوی صاحب موصوف کے مطالعہ کیے ہوئے الہلال کے یہ تمام پرچے اپنے ایک بزرگ مولوی محمد احمد صاحب کے ذریعہ جو مولوی صاحب کے سالے، شاگرد اور بہت ہی صاحب علم اور صاحب ذوق تھے، میرے ہاتھ آ گئے، جو میرے چھوٹے سے کتب خانہ کی زینت ہیں، ان پر جب نگاہ پڑتی ہے، یا کبھی کسی ضرورت سے مطالعہ کے لیے ان کو اٹھاتا ہوں، تو مولوی خدا بخش صاحب جیسے زاہد شب زندہ دار، متقی، پرہیزگار، متبع سنت، موحد کامل، عامل بالحدیث کی، ان کے ساتھ والہانہ شیفتگی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

غفراللہ لہ!

حاشیہ:

(۱) سعید احمد انصاری ندوی، مصنف سیر الصحابہ۔ ولادت ۱۶ر فروری ۱۸۹۴ء، وفات ۱۱ر اکتوبر ۱۹۶۲ء

مولانا آزاد اور مولانا فراہی کے آثار علمیہ

مولانا نجم الدین اصلاحی نے اپنے مضمون مندرجہ الجمعیۃ سنڈے ایڈیشن مورخہ ۱۳ر ستمبر ۱۹۵۹ء میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے آثار علمیہ کی تفصیل کے سلسلہ میں مولانا فراہی سے غایت محبت کی وجہ سے ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جن کا کوئی تعلق مولانا ابوالکلام کی علمی زندگی اوران کے علوم ومعارف سے نہیں ہے۔

مولانا حمید الدین فراہی کے اجزائے تفسیر اور دوسرے علوم و معارف کی نشرو اشاعت کے لئے مدت سے سرائے میر ہیں۔''دائرۂ حمیدیہ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے اور حسب توفیق وہ اب تک اپنے فرائض ادا کر رہا ہے۔ ماہنامہ ''الاصلاح'' جو مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت واہتمام میں نکلتا تھا اسی کا آرگن تھا، جس کا ہندوستان کے اچھے بلند پایہ دینی پرچوں میں شمار تھا اور جو بڑی قدر ومنزلت سے دیکھا اور بڑے شوق و دل چسپی کے ساتھ پڑھا جاتا تھا۔ اس میں کبھی کبھی مولانا فراہی کے تبرکات بھی شائع ہوتے تھے۔ ایک پریس بھی تھا۔ اس کا پچاس ہزار روپے کا ایک خطیر فنڈ بھی تھا جو مولانا امین اصلاحی کے نام سے بینک میں جمع تھا۔ لیکن یکایک مولانا امین اصلاحی کی علمی زندگی اور ملی خدمت کا رخ بدل گیا اور مولانا فراہی کی جو امانت ان کے سپرد ہوئی تھی اس کو چھوڑ کے جماعت اسلامی میں شریک ہوگئے۔ پریس اور رسالہ بند ہوگیا اور ملک کی تقسیم کے بعد

ان کے پاکستان میں بود و باش اختیار کرنے کی وجہ سے اس کا سرمایہ بھی جو بینک میں جمع تھا، اہمال میں پڑ گیا اور ہر طرح سے دائرۂ حمیدیہ کا سارا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔

اب پھر اس کا احیاء کیا گیا ہے اور اس کے موجودہ منتظمین نے حال ہی میں مولانا فراہی کی بعض تصانیف اور تفسیر کے اردو ترجموں کو ''کوہ نور پریس'' دہلی سے چھپوا کر نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے جن پر اردو کے بلند پایہ علمی رسالوں میں تبصرے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں نے بعض عربی رسالوں کے مسودے بھی مرتب کر لیے ہیں، جو عنقریب شائع ہوں گے۔

درحقیقت مولانا فراہی کے مسودات اور ان کے علمی متروکات تقسیم ہو گئے ہیں۔ ان کا بڑا حصہ تو دائرۂ حمیدیہ کی تحویل میں ہے لیکن کچھ حصہ مولانا امین احسن اصلاحی کے پاس پاکستان میں ہے۔ انہوں نے جماعت اسلامی میں کامل سولہ برس رہنے کے بعد اس سے ابھی حال میں استعفیٰ دے دیا ہے اور پھر مولانا فراہی کے علوم و معارف کی اشاعت کا کام شروع کر دیا ہے۔ بلکہ جماعت سے نکلنے سے پہلے ہی مولانا فراہی کے تمام اجزاءِ تفسیر کے اردو ترجموں کا ایک شاندار مجموعہ تفسیر فراہی کے نام سے شائع بھی کر چکے ہیں۔ وہ خود بھی مولانا فراہی کی تفسیر ''نظام القرآن'' کی روشنی میں تدبر قرآن کے عنوان سے ایک اردو تفسیر لکھ رہے ہیں اور وہ ان کے ذاتی رسالہ ''میثاق'' میں بہ اقساط شائع ہو رہی ہے۔ اس طرح سے ایک اور مستند اردو تفسیر انشاء اللہ ایک دن شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گی۔

لیکن ہمارے نزدیک اس سے کہیں زیادہ ضروری ان کے لئے مولانا فراہی کے علوم و معارف کے اردو میں منتقل کرنے کا کام ہے۔ جو انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں شروع کیا تھا۔ وہ ہو جاتا تو بڑا کام ہو جاتا۔ ان سے بہتر مولانا فراہی کے تلامذہ اور سرائے میر کے وسیع حلقہ میں یہ خدمت کوئی انجام نہیں دے سکتا، اور اس کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ اس میں وہ مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی تک پر سبقت لے گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے شگفتہ اردو ترجموں سے مولانا حمید الدین فراہی کو ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا ہے اس بارے میں ان کی حیثیت وہی ہے جو کسی زمانہ میں فلسفۂ ارسطو کے

شارح ومفسر علامہ ابن رشد کی تھی۔

بہر حال جہاں تک مولانا فراہی کی تفاسیر اور ان کے علوم ومعارف اور حکمت ودانش کے ضبط وتحریر اور نشر واشاعت کا تعلق ہے اس میں شاید کچھ کوتاہی ہوئی ہو، لیکن وہ جاری ہے۔ مگر مولانا ابوالکلام کی تفاسیر اور تصنیفات کی طبع واشاعت کے لئے بالکل پہلی مرتبہ دہلی میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں گورنر بہار کی صدارت میں ایک منظم ادارہ قائم کیا گیا ہے جس کے ارکان میں پروفیسر ہمایوں کبیر، پروفیسر اجمل خاں جیسے شیفتگان ابوالکلام بھی شامل ہیں۔ اس ادارہ نے غالباً پروفیسر اجمل خاں کی نگرانی میں جن کا بڑا گہرا تعلق مولانا سے رہا ہے مولانا کے مسودوں کی ترتیب اور ان کی تصانیف ورسائل وکتب کی جستجو وتلاش کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس کا پروگرام کیا ہے اور پہلے کون سی کتاب شائع ہوگی۔ اس کا ہمیں علم نہیں ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک سب سے اقدم اور ضروری ان کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' ہے جس کو وہ الہلال کی ادارت اور رانچی کے زمانہ نظر بندی سے لے کر اپنی زندگی کے نفس واپسیں تک لکھتے اور نظر ثانی کرتے چلے آرہے تھے، اور ان کے مسودوں کا بکس ہر حالت میں ان کے ساتھ رہتا تھا۔ یہاں تک کہ قلعہ احمد نگر جیل میں بھی ان کے ساتھ رہا، اور وہاں کی تنہائیوں میں ان پر نظر ثانی اور اضافہ وترمیم کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ بہر حال اس وقت ساری توقعات پروفیسر اجمل خاں سے وابستہ ہیں۔ خدا کرے وہ ایک ایک کر کے پوری ہوں، اور مولانا کا سارا سرمایہ فکر سنین وشہور کی قید کے ساتھ ان کے اہتمام میں منظر عام پر آجائے۔

اردو میں قرآن کی مستند تفسیروں کی بڑی کمی ہے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر بیان القرآن بہت ادق ہے جس کو صرف علماء ہی پڑھ سکتے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن ابھی زیر تکمیل ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تفسیر ماجدی تاج کمپنی لاہور کے بے رحم ہاتھوں میں ہے یہ کب شائع ہوگی؟ اس کے لئے کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ مولانا امین اصلاحی نے ابھی لکھنا شروع کیا ہے۔ مولانا کی تفسیر ترجمان

القرآن گو نامکمل ہے لیکن جس حد تک ضبط تحریر میں آچکی ہے وہ پورے تسلسل کے ساتھ ہے اور عام فہم ہے عام اردو خواں اس کو اچھی طرح پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں، اور مولانا نے لکھتے وقت نہ صرف یہ کہ خاص طور سے اس کا لحاظ کیا ہے بلکہ پہلی جلد کی تکمیل کے بعد جیسا کہ انہوں نے خود بھی اس کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ بعض لوگوں سے پڑھوا کر تجربہ کیا ہے تا کہ اس کا فائدہ صرف خواص اور اہل علم تک محدود ہو کر نہ رہ جائے۔

غیر مطبوعہ تفسیر کی جلدوں کے لئے ہماری رائے ہے کہ ان پر مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا اویس ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی وغیرہ جیسے بزرگوں سے نظر ثانی ضرور کرالی جائے۔ ہمیں کچھ یاد آتا ہے کہ مولانا کی جملہ تصنیفات اور خصوصاً تفسیر کی بقیہ جلدوں پر نظر ثانی کرانے کا مشورہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بھی برہان کے نظرات میں دیا ہے۔۔

مولانا حمید الدین اور مولانا ابوالکلام کا قرآنی ذوق بہت بلند تھا۔ وہ قرآن پر جب گفتگو کرتے تھے تو اسلاف کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کی زندگی کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ باوجود ہر طرح کی فراغت کے ہر طرح کے سکون واطمینان کے، ہر طرح کی آمادگی قلب و دماغ کے ان کی تفسیریں پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکیں اور نامکمل رہیں۔ مولانا ابوالکلام نے سورۂ مومنون تک (۱) امر بوط طور پر لکھا بھی لیکن مولانا حمید الدین نے جن کا رقرآن کا مطالعہ بہت وسیع تھا چند پاروں تک بھی مسلسل تفسیر نہ لکھ سکے۔ اور ہمارا خیال ہے انہوں نے کوئی مرتب اور مربوط تفسیر لکھنا چاہا بھی نہیں۔

ان سے مولانا ابوالکلام کا تعلق کسی قدر ضرور تھا جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ''حیات شبلی'' میں لکھا ہے کہ ''مولانا ابوالکلام کا قرآنی ذوق بھی درحقیقت ان کے قیام لکھنؤ کا رہین منت ہے۔ یہیں مولانا شبلیؒ کی مجلس علمی میں ان کی ملاقات مولانا حمید الدین سے ہوئی۔ اور ان کے ساتھ بھی کچھ دن انہوں نے بسر کئے۔ فیض صحبت سے عشق قرآن کا اثر ان میں بھی سرایت کر گیا۔ فہم قرآن کا یہی ابتدائی رنگ تھا جو ایک عرصہ کے

بعد تذکرہ الہلال میں اور پھر اس کے بعد تفسیر ترجمان القرآن کی صورت میں دنیا کو نظر آیا۔(۲)

ان دونوں بزرگوں کی ہم ذوقی فہم قرآن ہی کی حد تک تھی۔ مقاصد مختلف تھے۔مولانا حمید الدین قرآن کا مطالعہ ایک تو عرب جاہلی شعراء کے کلام کی روشنی میں کرتے تھے اور استشہاد میں انہی کے کلام کو پیش کرتے تھے، دوسرے وہ قرآن کے نظم کے قائل تھے یعنی قرآن محض سورتوں اور آیتوں کا ایک غیر مرتب و بے نظام مجموعہ نہیں بلکہ ایک مرتب نظام رکھتا ہے جس کی ہر سورہ اور ہر آیت ایک دوسرے سے معنوی و لفظی حیثیت سے مربوط اور ملی ہوئی ہے۔ یہی ان کا نظریہ تھا اور اسی کے تحت وہ قرآن کی ایک جامع تفسیر لکھنا چاہتے تھے جو وہ پوری نہ کر سکے۔لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ علماء نے عام طور سے ان کی تفسیر کی طرف اعتنا نہیں کیا۔ پھر ان کی تفسیر عربی زبان میں ہے جس کا افادہ بہت محدود ہے۔لیکن مولانا ابوالکلام کی تفسیر کا نقطہ نظر دوسرا ہے، دوسرے اردو میں ہے مگر علماء نے ان کی تفسیر کی طرف بھی جیسا کہ چاہیے اب تک اعتناء نہیں کیا ہے لیکن عام تعلیم یافتہ طبقہ میں وہ بہت مقبول ہے۔ اور نئی روشنی کے لوگ اس کو بے حد پسند کرتے ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ مولانا کی گوناگوں سیاسی وقومی وملی مصروفیتوں کی وجہ سے وہ پوری نہ ہوسکی۔ بہ ہر حال جہاں تک بھی اس کا مسودہ پروفیسر اجمل خاں صاحب کے پاس محفوظ ہو۔مولانا نجم الدین اصلاحی کی رائے کے مطابق اسے جلد سے جلد منظر عام پر آجانا چاہیے۔ان کی یہ تصنیف ہر اعتبار سے مقدم اور اہم بلکہ ان کی علمی زندگی کا شاہکار ہے اور اسی کی طبع واشاعت کی طرف پہلے توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔مولانا ابوالکلام نے یوں تو بہت کچھ لکھنا چاہا اور لکھا بھی لیکن کوئی چیز مکمل نہ ہوسکی۔ان کی مطبوعہ تصانیف کے علاوہ کچھ اور تصانیف اور تحریروں کا سراغ بھی ان کے مکاتیب سے چلتا ہے یہ اور بات ہے کہ وہ دستبرد زمانہ کی نذر ہوگئی ہوں اور محفوظ نہ ہوں۔

ایک حیات شاہ ولی اللہؒ اور دوسری سوانح ابن تیمیہؒ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے ابن تیمیہؒ پہ جو مواد اکٹھا کیا تھا وہ وہی ہے جو اصحاب دعوت وعزیمت کے سلسلہ میں تذکرہ میں آ گیا ہے یا وہ کوئی الگ سے اور مستقل چیز ہے جو اب تک منظر عام پر نہیں آسکی

ہے۔ان دونوں کتابوں کو وہ جیسا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے نام کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے، بڑے جوش وخروش سے لکھ رہے تھے۔خصوصاً سیرۃ شاہ ولی اللہ کے سلسلہ میں کسی نئی کتاب یا کسی نئے ماخذ کا پتہ چلتا تھا تو اس کے حصول کے لئے بے قرار ہو جاتے تھے۔ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی ہی ایک ذات ہے جو نہایت فخر ومباہات کے ساتھ غزالی ورازی اور فارابی وغیرہ کے مقابلہ میں پیش کی جاسکتی ہے۔یہ قابل افسوس بات ہے کہ ''الفرقان'' کے ایک مبسوط شاہ ولی اللہ نمبر کے علاوہ ان کی کوئی مبسوط ومستند سوانح عمری اردو میں اب تک نہیں لکھی جاسکی ہے اگر مولانا کی یہ تصنیف موجود اور مکمل ہے تو اردو زبان کی ایک اہم ضرورت پوری ہو جائے گی۔

حواشی:

(۱) مولانا کے کاغذات میں سورۂ نور کا مکمل ترجمہ نکل آیا تھا۔ساہتیہ اکادیمی ایڈیشن جو چار جلدوں میں مرتب ہو کر شائع ہوا ہے۔اس کی آخری جلد میں شامل کر دیا گیا۔

(۲) یہ بات عشق قرآن کے اثر ونفوذ کی حد تک تو صحیح ہو سکتی ہے کہ حضرت فراہی کی قرآن حکیم سے عشق وشیفتگی نے ابوالکلام کو کسی نہ کسی حد تک متاثر کیا ہو۔لیکن جو بات حضرت فراہی کے ذہن پر مستولی تھی یہ کہ ''مولانا حمیدالدین قرآن کا مطالعہ ایک تو عرب جاہلی شعرا کے کلام کی روشنی میں کرتے تھے اور استشہاد میں انہیں کا کلام پیش کرتے تھے۔دوسرے وہ قرآن کے نظم کے قائل تھے۔۔۔۔''۔ان کا سراغ اس حد مولانا آزاد کی خصوصیات تفسیر میں لگانا پڑے گا۔مولانا آزاد نے قرآن حکیم کے مطالب ومفاہیم کی تفسیر میں سب سے زیادہ استدلال صحابہ کے آثار واقوال سے کیا ہے اور مطالب قرآن کی وضاحت میں ان کی اہم خصوصیت تفسیر آیات بالآیات ہے۔شعرائے جاہلیت کے کلام سے قرآن کی فصاحت وبلاغت میں بھی شاید ہی کہیں انہوں نے استشہاد کیا ہو۔شعرائے جاہلیت کے کلام سے قرآن کی بے مثال فصاحت اور اعلیٰ بلاغت پر استشہاد اور اس سے قرآن کے معانی ومفاہیم پر استدلال کرنا، دو الگ الگ چیزیں ہیں، جو عوام یا خواص تفسیر قرآن میں آیات کے مفاہیم ومطالب کے متلاشی ہوں گے۔ان کے ذوق پر حضرت فراہی کی تفسیر کبھی پوری نہیں اتر سکتی۔ (ا۔س۔ش)

مولانا ابوالکلام آزاد
اور
مولانا عبداللہ العمادی

مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں اُن کا تعارف کرایا ہے۔ الندوہ نے صاحب صلاحیت آدمیوں کو اہل علم سے روشناس کرایا، اور وہ بعد میں علم وفن کی مسندوں پر متمکن ہوئے اور ان کے علمی کارناموں سے آج ہندوستان کی علمی دنیا گونج رہی ہے، ان میں سب سے پہلا نام مولانا عبداللہ العمادی کا ہے، یہ جونپور کے ایک گاؤں امرتھوا کے رہنے والے اور عمادالدین نامی اپنے خاندان کے کسی بزرگ کی نسبت سے اپنے کو عمادی لکھتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنا نام ''خدابندہ'' لکھتے تھے، جو عبداللہ کا فارسی ترجمہ ہے، لیکن شہرت عبداللہ عمادی کو حاصل ہوئی۔

ادب عربی میں مولانا عبدالعلی آسی مدراسی لکھنوی کے شاگرد تھے، اس زمانہ میں جبکہ الندوہ لکھنؤ میں چھپ کر شائع ہونا شروع ہوا، مولانا آسی کے عربی رسالہ البیان لکھنؤ کے اڈیٹر تھے، فارسی وعربی ادبیات اور تاریخ سے فطری مناسبت رکھتے تھے اور لکھنو میں مولانا شبلی سے اکثر ملتے رہتے تھے۔ الندوہ کا دفتر شاہ جہاں پور سے منتقل ہو کر لکھنؤ آیا، تو رسالہ مولوی عبدالعلی آسی مدراسی مرحوم کے مطبع اصح المطابع لکھنو میں چھپنے لگا، بعد میں اس مطبع کا نام مولوی آسی صاحب کی نسبت سے مطبع آسی ہوگیا تھا، یہیں سے ہندوستان کا واحد عربی ماہنامہ البیان بھی نکلتا تھا، الندوۃ اور البیان کے سرورق پر پریس کا

نام آسی ہی لکھا ہے۔

مولانا عمادی کی عربی اور اردو میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیتوں کی بنا پر ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی کے ایماء سے الندوہ جیسے وقیع اور گرانقدر علمی رسالہ کی ادارت بھی ان کے سپرد کردی گئی، جس کو انھوں نے بہ حسن وخوبی انجام دیا۔ اس حیثیت سے اُن کے بعض بیش قیمت مضامین الندوہ میں شائع ہوئے، اور انھوں نے قبول عام کی سند حاصل کی، اور البیان کے محدود حلقہ سے نکل کر اُن کی شہرت اردُو ادب وزبان کے وسیع حلقہ تک پہنچ گئی، اوران کا نام اُس وقت کے تمام محققین اور اہل علم کی زبانوں پر آ گیا، مثلاً اعجاز القرآن اور علم مناظرہ وغیرہ۔ الندوہ سے نکل کر وکیل امرتسر، زمیندار لاہور اور الہلال کلکتہ میں اپنے ذوق کے مطابق مضمون لکھتے اور ان اخباروں کے لائق مدیران مسئول کی نگرانی و راہنمائی میں ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، آخر میں حیدر آباد میں جامعۂ عثمانیہ قائم ہوا اور اس کے نصاب کی کتابوں کے لیے دارالترجمہ قائم ہوا، تو اس میں جہاں انگریزی وعربی علوم وفنون کی کلاسیکل کتابوں کے ترجمہ کے لیے ہندوستان کے بہت سے فضلاء اور اہل قلم رکھے گئے۔ یہ بھی اُس میں عربی کے مترجم ہو گئے تھے اور تاریخ کی بہت سی عربی کتابیں مثلاً تاریخ طبری، طبقات ابن سعد، تاریخ یعقوبی، اور ملل ونحل شہرستانی کی دونوں جلدیں بھی اردو میں منتقل کیں اور جامعہ عثمانیہ کے تاریخ کے نصاب میں شامل کی گئیں اور ان ترجموں کی وجہ سے حیدر آباد کے علمی حلقوں میں بہت متعارف ہو گئے تھے اور بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، الہلال کے ادارۂ تحریر سے تعلق کے زمانہ میں بھی انھوں نے جو مضامین لکھے وہ بھی عام طور سے بہت پسند کیے گئے، اہل علم نے ان کی قدر کی اور ان کی پختگی قلم کی داد دی، چونکہ الہلال کے دستور کے مطابق شرکاے ادارت کے جو مضامین شائع ہوتے تھے، ان میں نام کی صراحت نہیں ہوتی تھی، یہ اور بات ہے کہ اداشناس ان کے اسلُوب وطرز نگارش سے پہچان لیتے تھے کہ کونسا مضمون کس کے قلم کا ہے، اس لیے ان کے بھی بعض مضامین بغیر نام کے شائع ہوتے اور بعد کو مولانا سید سلیمان ندوی کے بعض مضامین کی طرح اُن کے وہ بے نام کے مضامین بھی مولانا ابوالکلام کی

طرف منسوب ہو گئے ۔اور ناشرین نے تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی ،اور یہ مضامین بھی مولانا ابوالکلام کے مضامین کے مجموعوں میں شامل کر دیے اور تو اور خود مولانا ابوالکلام نے بھی اس کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی ،اور وہ ایک عرصہ تک مولانا ابوالکلام کے مضامین کے مجموعوں کے ساتھ چھپتے رہے ،سیّد صاحب نے بطور واقعہ کے اپنی ایک تحریر میں جہاں اپنے اس طرح کے مضامین سے پردہ اُٹھایا ، وہاں مولانا عبداللہ العمادی جن سے ہم مشربی وہم ذوقی کی بنا پر لکھنؤ ہی میں بڑے دوستانہ اور مخلصانہ تعلقات ہو گئے تھے ،اُن کے اور مولانا عبدالسلام ندوی کے مضامین پر سے بھی پردہ اُٹھایا ، اور بتایا کہ یہ مولانا ابوالکلام کے نہیں ، ان حضرات کے ہیں ،اس سے مولانا ابوالکلام کے نادان دوست سیّد صاحب سے بہت برہم ہو گئے اور ان مضامین کی ملکیت کا ایک مستقل فتنہ کھڑا کر دیا۔جس میں پیش پیش ابوسلمان شاہ جہاں پوری اور جامع عمر آباد مدراس کے بعض فضلاء تھے اور سید صاحب پر کیچڑ اچھالنے کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ،سیّد صاحب کے معتقدوں نے ان کا جواب تو ضرور دیا ، اور ان مضامین کی اندرونی شہادتوں سے ثابت کیا ، کہ یہ مضامین اپنے طرز واسلوب کے لحاظ سے انہی لوگوں کے ہو سکتے ہیں ،مولانا ابوالکلام کے نہیں ہو سکتے ، لیکن خود سیّد صاحب نے اس حقیقت کے واشگاف کرنے کے بعد پھر اس بحث اور تحریری مجادلہ میں کوئی حصہ نہیں لیا ، اور یہ کہہ کر مکمل خاموشی اختیار کر لی ۔

تم ہی سچے سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے

اور پھر جہاں تک خود ان مضامین کا تعلق ہے ، وہ ان کے بعد کے عظیم الشان علمی کارناموں کے مقابلہ میں چنداں وقیع بھی نہیں تھے ، کہ ان کی ملکیت کے لئے وہ خود اصرار کا سلسلہ قائم رکھتے ۔

ان میں ایک سب سے معرکۃ الاراء اور متنازع فیہ مضمون مشہد اکبر نمبر 1 تھا ، اس کو بھی مولانا ابوالکلام کا سمجھ کر ، ان کے مضامین کی مجموعوں میں شامل کر لیا گیا تھا ، اور ان کے معتقدین خصوصاً ابوسلمان شاہ جہانپوری بہت زمانہ تک اصرار کرتے رہے کہ مولانا ابوالکلام ہی کا ہے ، اور اس سلسلہ میں سید صاحب علیہ الرحمہ کے استخفاف کا کوئی دقیقہ اٹھا

نہیں رکھا، جامع عمر آباد کے فضلاء نے تو یہاں تک لکھ دیا، کہ اس وقت سید صاحب میں اس طرح کے مضمون لکھنے کی سرے سے صلاحیت ہی نہیں تھی، لیکن اس کے متعلق تفصیل کے ساتھ اندرونی شہادتیں پیش کی گئیں تو متفقہ طور پر اعتراف کرلیا گیا کہ وہ سید ہی صاحب کا ہے، اور مولانا ابوالکلام کی غیر موجودگی میں جب کہ وہ کسی مصلحت سے اپنے مستقر کلکتہ چھوڑ کر مسوری میں مقیم تھے، بغیر ان کی نظر ثانی اور حک و اضافہ کے ۱۳-اگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں شائع ہوا تھا اور اسی ولولہ انگیز مضمون یا اداریہ کی وجہ سے الہلال کی اس تاریخ کی پوری اشاعت جس کو مولانا آزاد کی غیر موجودگی میں سید ہی صاحب نے اپنی ذمہ داری پر مرتب کیا تھا، گورنمنٹ بنگال نے ضبط کرلی تھی، اس زمانہ میں ''مشہد اکبر'' الہلال کا مستقل عنوان تھا، جس کے تحت حادثہ کانپور سے متعلق خبریں، اداریے، مراسلات، مضامین اور تاثرات شائع ہوئے تھے اور اس کا سلسلہ اس وقت تک قائم رہا، جب تک وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ نے کانپور آ کر اس کا فیصلہ نہیں کر دیا، انہی میں مولانا ابوالکلام آزاد کے شعلہ بار قلم سے ایک اشاعت کا اداریہ مشہد اکبر نمبر 2 بھی تھا، جو ان کے رجزیہ اسلوب نگارش کا پورا آئینہ دار تھا، جس کا ایک ایک حرف پکار پکار کر کہہ رہا ہے، کہ انہی کے قلم کا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کے لکھے ہوئے مشہد اکبر نمبر 1 کا انداز بھی رجزیہ ہے اور بے حد مؤثر اور ولولہ انگیز لیکن الفاظ، تراکیب، عبارت، اسلوب ہر اعتبار سے مولانا ابوالکلام کے فطری منفرد اسلوب سے بالکل مختلف ہے جس کو ادب و زبان کے مبصر ہی سمجھ سکتے اور اس میں امتیاز پیدا کر سکتے ہیں، لیکن ہے وہ مولانا سید سلیمان ندوی کی محدود صحافتی زندگی کا ایک شاہکار، جس پر خود ان کو، ان کے معتقدین، ان کے تلامذہ کو ناز ہو تو بیجا نہیں ہے، لیکن خود مولانا سید سلیمان ندوی نے اس جذبہ کے تحت قطعی اس قسم کے مضامین کی نشان دہی خوانخواستہ نہیں کی تھی، بلکہ اس کا مقصود یہ تھا، کہ جو مضامین واقعی مولانا ابوالکلام کے قلم سے ہوں، وہی ان کی مضامین کے مجموعوں میں رکھے جائیں، دوسرے کے نہ رکھے جائیں، کہ آئندہ مورخوں کو اگر ان کی ضرورت پیش آئے تو ان کو الگ کرنے میں بڑی دشواری پیدا ہوگی۔

اب تو ایک ایک سطر اور ایک ایک لفظ کے متعلق تحقیقات شروع ہوگئی ہے، کہ وہ اصل مصنف کا ہے یا دوسرے کا، جیسا کہ خیام کی رباعیات میں امتداد زمانہ سے دوسرے رباعی گو شعرا کی بہت سی رباعیاں شامل ہوگئی تھیں، جن کو بعد میں الگ کرنے میں خود یورپ کے مستشرقین اور محققین کو بڑی دشواریاں پیش آئیں، سید صاحب نے خیام پر جب اپنی عالمانہ و محققانہ کتاب مکمل کی، تو ان کو بھی خیام کی رباعیات کے متداول نسخوں کے اس حیثیت سے جائزہ لینے کی ضرورت پیش آئی، تو معلوم ہوا، کہ ایک دو نہیں، سیکڑوں رباعیاں الحاقی ہیں، اور وہ یا تو اس کے معاصر شعرا کی ہیں یا بعد کے شعرا کی ہیں اور مضامین کی مناسبت سے مرتبین نے خیام کی سمجھ کر اس کی رباعیات میں شامل کر دی ہیں، سید صاحب نے اپنے کتب خانہ دیسنہ کے ایک مستند نسخہ کی مدد سے از سر نو اس کی رباعیوں کو مرتب کر کے اپنی اس کتاب میں شامل کیا۔

سید صاحب نے اس نقطۂ نظر سے ان مضامین کی بھی نشان دہی کر کے آیندہ کے محققین کے لئے جو الہلال کے مضمون نگاروں پر ریسرچ کرنا چاہیں، بڑی آسانی پیدا کر دی ہے اور اس آسانی کے لئے ادب و زبان کے خدمت گذاروں کو ان کا مشکور و ممنون احسان ہونا چاہیے، شرکائے ادارہ الہلال بعض بعض تو مضمون نگاری سے آگے نہیں بڑھے اور مضمون نگار اور صحافی ہی رہ گئے اور بعض اردو کے بہت بڑے مصنف اور ابوالکلام ہی کی طرح ادب و زبان کی دنیا میں بڑی شہرت کے مالک ہوگئے، انہیں میں ایک البیان عربی اور الندوہ اردو کے سابق اڈیٹر مولانا عبداللہ العمادی تھے، جن کو اردو اور عربی لکھنے پر یکساں قدرت حاصل تھی، عربی کے لئے تو البیان کے عربی مضامین پیش کئے جا سکتے ہیں، جن کا فائل دارالمصنفین اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانوں میں موجود ہے اور اردو کے لئے خود البیان کا اردو کالم، الندوہ کے مضامین، بہت ساری کتابیں اور عربی کتابوں کے ترجمے اور مضامین، جن کا سلسلہ حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بہت بعد تک قائم رہا۔

انہی شرکائے ادارہ میں ایک مولانا ابوالحسنات بہاری ندوی تھے، جن کا ایک

زمانہ تک الہلال سے تعلق رہا، اور اس میں مضامین لکھتے رہے، یہیں ان سے سید صاحب کی ملاقات ہوگئی اور جوہر قابل پاکر، مزید تعلیم کے لئے ان کا داخلہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کرادیا، انہوں نے ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا شبلی کی خدمت میں ایک فارسی قصیدہ لکھ کر پیش کیا تھا، جس سے وہ بہت متاثر ہوئے، دارالمصنفین کے لئے وہاں جن طالب علموں پر ان کی نگاہ انتخاب پڑی تھی، ان میں ایک مولوی ابوالحسنات بھی تھے۔

جب وہ ۱۹۱۸ء میں ندوہ سے فارغ ہوئے تو سید صاحب نے ان کو دارالمصنفین کی رفاقت میں لے لیا، جہاں ان کو پہلے رقعات عالم گیری کی ترتیب کا کام دیا گیا، یہ انجام دے ہی رہے تھے، کہ بدقسمتی سے مرض عرق النساء میں مبتلا ہو گئے، اس سلسلہ میں بجلی علاج کے لئے کلکتہ آنے کا علم ہوا، تو مولانا آزاد خاص طور پر ان کی عیادت کے لئے ہمارے گھر تشریف لائے، افسوس ہے کہ اس مرض ناہنجار میں بالآخر راج گیر کے سینی ٹوریم میں جہاں آخری علاج کے لئے گئے تھے، انتقال کر گئے، معارف میں ان کا ایک سلسلہ مضمون ہندوستان کے عہد اسلامی کے مدارس اہل علم میں بہت پسند کیا گیا، ان کے انتقال کے کچھ دنوں کے بعد اس کو اسی نام سے اپنے ایک مختصر مقدمہ کے ساتھ سید صاحب نے کتابی صورت میں بطور یادگار کے شائع کر دیا ہے، جس کو دیکھ کر ان کی بے اختیار یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ میری ان سے ملاقات کلکتہ میں ہوئی تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد
اور
مولانا ابوالحسنات ندوی

میں ابھی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں متوسطات سے گزر کر اونچے درجہ کی عربی کتابیں پڑھ رہا تھا کہ پہلی پنج سالہ جنگ کے اختتام پر ۱۹۱۸ء میں عین اس دن جبکہ ہندوستان میں کیا، سارے قلمرو برطانیہ میں جشن صلح منایا جارہا تھا، میرے والد کا انفلوئنز میں انتقال ہوگیا اور میری عربی تعلیم جس کو میرے والد نے بڑے ولولہ اور شوق سے شروع کرایا تھا، خطرہ میں آ گئی، کچھ دنوں تک میرے والد کے چچازاد بھائی اور ایک اخیانی بھائی نے کفالت کی اور میری تعلیم جاری رہی، پھر اس سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، اور میرے والد کے اخیانی بھائی منشی عبدالغفور صاحب نے جو ہمارے کفیل تھے، مجھ کو کلکتہ بلا لیا، اور اپنے یہاں کی ایک معمولی اسامی پر لگا دیا، جو میری تعلیم و تربیت اور ذوق کے سخت منافی تھی، اسی زمانے میں مولانا ابوالحسنات ندوی رفیق دارالمصنفین اپنے مرض عرق النساء کے بجلی کے علاج کے لئے کلکتہ آئے، اور مولانا سید سلیمان ندوی کی سفارش سے انہی منشی عبدالغفور صاحب کے مہمان ہوئے، جن کے سید صاحب سے بڑے عقیدت مندانہ تعلقات تھے اور دارالمصنفین کے ماہانہ رسالہ معارف اور اس کی تمام مطبوعات کے مستقل خریدار تھے، یہیں مولانا ابوالحسنات سے میری ملاقات ہوئی، اس ادب کش ماحول میں ان کی محبت میرے لئے بہت زیادہ درجہ تسکین ثابت ہوئی اور مجھے ایسا محسوس ہوا، کہ پھر سرائے میر کی اس تعلیمی اور علمی فضا میں پہنچ گیا ہوں، جس سے نکل کر بادل ناخواستہ کلکتہ آیا

تھا، وہ روزانہ متعدد اردو کے کئی روزنامے خریدتے تھے اور کبھی کبھی اوٹرم گھاٹ اور وائسرالیگل لاج کی طرف سیروتفریح میں بھی اپنے ساتھ مجھ کو لے جاتے تھے، وہ ایک زمانہ میں الہلال کے اسٹاف میں تھے، وہیں سے سید صاحب کی تحریک سے دارالعلوم ندوہ میں مزید تعلیم کے لئے داخلہ لیا اور ۱۹۱۸ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد سید صاحب نے ان کو دارالمصنفین کی رفاقت کے لئے بلا لیا۔ کلکتہ میں اپنی آمد کے کچھ دنوں کے بعد، مولانا ابوالکلام آزاد کو اپنی علالت کے لئے کلکتہ میں اپنی آمد کی اطلاع کرنی چاہی، تو اس کے لئے انہوں نے میرا انتخاب کیا، اور ایک خط لکھ کر دیا کہ اس کو مولانا کے یہاں پہنچا آؤ۔ میں اس پیام بری سے بہت خوش ہوا کہ اس بہانے سے میں بہت قریب سے مولانا کی زیارت کرلوں گا اور ملاقات بھی، جس کے لئے میں بدوِ شعور ہی سے آرزومند تھا، مولانا کا مستقر ایڈن ہاسٹل روڈ سے جہاں میں رہتا تھا، کوسوں فاصلہ پہ تھا، لیکن شوق زیارت نے مجھ میں بجلی کی سی طاقت پیدا کردی اور پیدل ایک گھنٹہ کا راستہ میں نے دس منٹ میں طے کرلیا، مولانا کا مکان ایک گلی صالح لین میں ایک چھوٹے سے احاطے کے اندر تھا، سامنے کچا صحن تھا، اس کے بعد دومنزلہ مکان جو بہت معمولی تھا۔ نیچے ایک لمبا برآمدہ تھا، اس میں ایک پرانی اور سڑی گلی بنچ بچھی ہوئی تھی، زائرین ملنے کے انتظار میں اس پر آکر بیٹھتے تھے، اسی برآمدہ سے ملا ہوا ایک زمین دوز کمرہ تھا، جس میں البلاغ پریس تھا، اسی میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور البلاغ پریس کے منیجر اور مولانا کی کتاب تذکرہ کے ناشر فضل الدین احمد بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، میں مولانا عبدالرزاق کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ میری طالب علمی کے زمانہ میں انہوں نے ہمارے درجہ کے عربی ادب کا امتحان بھی لیا تھا، میں انتظار کرتے کرتے تھک گیا، تو انہی مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی سے بغیر کسی تعارف کے عرض کیا کہ میں مولانا ابوالحسنات ندوی رفیق دارالمصنفین کا مولانا کے نام ایک دستی خط لایا ہوں، اگر آپ اس کو مولانا تک پہنچا دیتے تو بڑا کرم ہوتا، انہوں نے میرے ہاتھ سے خط لے کر، مولانا کی خدمت میں اوپر بالا خانہ پر پہنچا دیا، کچھ دیر کے بعد میرے پاس ایک آدمی آیا، کہ آپ کا خط

مولانا کو مل گیا ہے، اب آپ واپس جا سکتے ہیں اور میں بصد حسرت و یاس یہ شعر پڑھتا ہوا واپس چلا آیا:

تہی دستان قسمت راچہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

میں مولانا ابوالکلام آزاد کے دانش کدۂ علم و کمال سے بصد حرمان و یاس واپس تو ضرور چلا آیا تھا، لیکن وہی حسرت دید کی تکمیل کا ذریعہ بن گیا، ہم ابھی اپنے روزانہ کے ہر طرح کے معمولات سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے، کہ مولانا علی الصباح مولانا ابوالحسنات کی عیادت کے لیے ہمارے گھر پہنچ گئے، جس کا ہم کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتے تھے، گھر کے سارے افراد مولانا ابوالحسنات کے پلنگ کے اردگرد بیٹھ گئے، یعنی منشی عبدالغفور صاحب، ان کے داماد مصطفیٰ انصاری، ان کے دونوں نواسے عبدالوحید اور محمد مشاغل اور میں، مولانا ابوالحسنات نے ابتدائے مرض سے لے کر کلکتہ کے سفر تک کی پوری روداد مجملاً ان کو سنادی، جس سے وہ بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ کلکتہ میں میرے لائق کوئی خدمت ہو تو مجھے یاد فرمایئے گا۔ اُس کے انجام دینے میں مجھے بڑی مسرت ہوگی۔ یہیں میں نے مولانا ابوالکلام کو قاب قوسین کی حد تک بہت قریب سے دیکھا بھی اور باتیں بھی کیں، ان سے مصطفیٰ انصاری صاحب کا اس حیثیت سے تعارف کرایا گیا، کہ حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری کے بھانجے، لکھنو کے مشہور ماہر امراض چشم ڈاکٹر عبدالرحیم کے لائق ترین صاحب زادے اور مالک مکان منشی عبدالغفور صاحب کے خویش ہیں، تو مولانا نے بڑی حیرت کا اظہار کیا، اور ان سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا، مولانا ابوالکلام نے بدعات و محرمات سے بھرے ماحول سے نکلنے کے بعد، جہاں ملک کے متعدد ارباب کمال، مثلاً سرسید علیہ الرحمتہ، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی، مولانا حمید الدین فراہی کی کتابوں سے استفادہ کیا تھا، ایک روایت کے مطابق حافظ عبداللہ صاحب محدث غازی پوری سے بھی استفادہ کیا تھا، اور ان کے حلقۂ درس میں بھی شرکت کی تھی، پھر مولانا ابوالحسنات نے اپنے پورے زمانۂ قیام میں دوبارہ کسی خدمت کے لیے ان کو خط نہیں لکھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد
اور
مولانا عبدالسلام ندوی

ادارۂ الہلال سے مولانا سید سلیمان ندوی کے فرگوسن کالج پونہ میں فارسی کی پروفیسری پر جانے کے بعد اس میں جو خلا پیدا ہو گیا تھا، اس کو انہی کے جیسا عربی علوم کا فاضل پر کر سکتا تھا، جس کو قدیم عربی کے ساتھ جدید عربی پر بھی پوری قدرت ہو، اور جدید عربی مطبوعات، رسائل، اخبارات کے مضامین کو بے تکلف اردو میں منتقل کر سکتا ہو، اس کے لئے مولانا آزاد کی نگہ انتخاب ندوہ ہی کے ایک فارغ التحصیل پر پڑی اور وہ مولانا عبدالسلام ندوی تھے، جن کے مسئلہ تناسخ پر ایک بہترین مضمون کا علمی حلقوں میں بڑا چرچا تھا۔ وہ مولانا شبلی اور مولانا شروانی کی مشترکہ ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کی سب ایڈیٹری کا فرض ادا کر رہے تھے، اسی زمانہ میں ان کے بعض مضامین پر مولانا شبلی نے ان کے متعلق پیشین گوئی کی تھی، اور اپنے دوست مہدی افادی الاقتصادی کو ایک خط میں لکھا تھا، کہ وہ انشاءاللہ خالی ہونے والی کرسیوں کا مستحق ہوگا۔ مولانا ابوالکلام نے ان کو ادارۂ الہلال میں شریک ہونے کے لئے خود مولانا شبلی ہی کو لکھا اور انہوں نے بخوشی مولانا عبدالسلام کو وہاں جانے کی اجازت دے دی اور وہ الہلال میں چلے گئے، چونکہ مولانا شبلی کو تجربہ ہو چکا تھا، کہ الہلال میں بغیر نام کے صراحت کے مضامین چھپنے کی وجہ سے مولانا سید سلیمان کو جتنا ملک کو جاننا چاہیے تھا، اتنا نہ جان سکا اور ان کی شہرت پر کسی قدر پردہ پڑا

رہا، اس لئے انہوں نے مولانا عبدالسلام کو لکھا کہ میں تمہارے مضامین پڑھتا ہوں، مولانا ابوالکلام صاحب اجازت دیں تو نام لکھا کرو، ایسے مضامین گمنام ٹھیک نہیں۔ اس سے کیا فائدہ کہ ایک شخص کی زندگی گم ہو جائے، تمہاری قوت اور نمود سے بہر حال ہماری سوسائٹی کو فائدہ ہی ہوگا۔ ہر مدیر، ہر رسالہ، ہر اخبار کی پالیسی الگ الگ ہوتی ہے، جس پر قائم رہنے کا اس کو بہر حال حق ہے، مولانا ابوالکلام کی اس وقت ادبی شہرت کا شباب تھا، انہی کی نسبت سے پورا الہلال ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا۔ اس لئے اسٹاف کے لوگوں کے مضامین، ترجے اور تلخیص بغیر نام کی صراحت کے شائع ہوتی تھیں کہ ان کو مولانا کا سمجھ کر اسی دلچسپی اور شوق سے پڑھا جائے، پھر بھی مولانا شبلی کی خواہش یہی تھی، کہ مولانا عبدالسلام کے قلم سے جو چیز بھی الہلال میں چھپے، اس پر ان کا نام ضرور ہو، مگر الہلال آخر تک اپنی پالیسی پر قائم رہا، اور ان کے بھی بہت سے مضامین جو ان کی شہرت اور نام و نمود کا باعث ہوئے، بغیر نام کے چھپ گئے، سید صاحب نے اپنے اور مولانا عبداللہ عمادی کے مضامین پر سے پردہ اٹھایا، تو ان کے مضامین کی بھی نشاندہی کی، میرے خیال میں نام نہ ظاہر کرنے میں مولانا ابوالکلام کی کسی قسم کی بدنیتی کو دخل نہیں تھا، اور نہ اپنے اور ان حضرات کے مضامین پر سے پردہ اٹھانے میں مولانا سید سلیمان کی بدنیتی کو حاشا وکلا دخل تھا، جبکہ ان کے ناقدین نے خواہ مخواہ اس کا پروپیگنڈا کیا، سید صاحب کا منشا محض ایک حقیقت کا اظہار تھا۔

مولانا شبلی جیسا کہ ان کے خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ضرور چاہتے تھے، کہ جو لوگ بھی الہلال کے ادارہ تحریر میں شریک ہوں، ان کے مضامین کے ساتھ ان کا نام ضرور ہو کہ ان کے ناموں پر پردہ پڑ جانے سے ندوہ کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کی شہرت کے ماند ہو جانے کا اندیشہ تھا، اس لئے وہ برابر مولانا عبدالسلام کو لکھتے رہتے کہ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا نام ضرور لکھو بلکہ مولوی ابوالکلام سے اجازت بھی لے لو، لیکن الہلال نے اپنی پالیسی نہیں بدلی، اور جب تک زندہ رہا، وہ اپنی اسی روش پر چلتا رہا، اور اور شرکائے ادارۂ تحریر کے مضامین بلا نام کے آخر تک چھپتے رہے۔ اس لئے شرکائے ادارہ کو اپنی ادبی

وتحریری صلاحیتوں کے لحاظ سے جیسا کہ چمکنا چاہیے تھا، نہ چمک سکے اور وہی جب اس کو چھوڑ کر دوسری جگہ گئے، تو خوب چمکے، بلکہ ادبی دنیا میں ایک مقام پیدا کرلیا، خود مولانا عبدالسلام نے اپنی کتابوں خصوصاً اسوۂ صحابہ، انقلاب الامم، شعرالہند، اقبال کامل وغیرہ کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی اور ان کی کتاب شعرالہند بہت زمانہ تک بعض یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اردو نصاب میں رہی۔

ندوہ کی اسٹرایک ندوہ کی زندگی کا ایک اہم اور تاریخی واقعہ ہے، اس کی ہمدرری میں ملک کا روشن خیال طبقہ جس کی رہبری مولانا ابوالکلام کررہے تھے اور اس کو انہوں نے اپنے زورِ قلم اور پے درپے مضامین سے ملک کا ایک اہم مسئلہ بنادیا، لیکن علماء میں ایک طبقہ اس کا سخت مخالف تھا اور اس کو بدعت سمجھتا تھا، اس کے سرخیل مولانا شبیر احمد عثمانی تھے، جن کا جواب انہی مولانا عبدالسلام نے بہت پرزور اور مدلل دیا، جو الہلال میں ان ہی کے نام سے کئی قسطوں میں چھپا، اس کا شمار الہلال کے بہترین اور منتخب مضامین میں ہے۔(۱)

مولانا ابوالکلام، مولانا عبدالسلام کی قابلیت اور علمی صلاحیت کے اسی زمانہ سے معترف تھے اور ان کو بڑی عزت اور محبت سے یاد کرتے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی کو جب بھی خط لکھتے تھے تو ان کی خیریت معلوم کرنے کے ساتھ ان کے علمی مشاغل کے بارے میں ضرور دریافت کرتے تھے، مولانا عبدالسلام نے موسیو لیبان کی ایک کتاب کے عربی ترجمہ ''سرتطورالامم'' کا ''انقلاب الامم'' کے نام سے بہت ہی انشاپردازانہ ترجمہ کیا تھا، مولانا ابولکلام کو بھی بھیجی گئی، تو اس کے متعلق سید صاحب کو لکھتے ہیں:

> ''مولانا عبدالسلام صاحب نے اصل کتاب کا ترجمہ اتنا پرزور، مؤثر اور دلچسپ کیا ہے کہ اس سے بہتر نہیں ہوسکتا، خوشی اس کی ہے کہ ایک عمدہ اور علمی کتاب اردو میں شائع ہوگئی''

ان کے معارف میں ایک شائع شدہ مضمون پر جو تمام تر بغدادی کی کتاب الفرق سے ماخوذ تھا، سید صاحب کے نام ایک خط میں ان الفاظ سے داد دیتے ہیں:

''بایں ہمہ استعداد انہوں نے اپنے آپ کو کیوں گرادیا ہے''

خود مولانا عبدالسلام کو بھی مولانا آزاد سے بڑا تعلق خاطر تھا، وضع ولباس میں انہی کی تقلید کرتے تھے، یعنی سر پر بالدار کمپاخ، گلے میں نہایت عمدہ اور خوش رنگ کپڑے کی اچھی سلی ہوئی شیروانی، ٹخنے سے نیچا پائجامہ، عمدہ ترشی ہوئی نوک دار مونچھیں، جن کو ہر وقت دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے خواہ کسی حالت میں بھی ہوتے، بلکہ نماز تک میں تاؤ دیا کرتے، جاڑوں میں شیروانی کے اوپر گلے میں اونی چادر لپیٹے رہتے، یہی وضع اور لباس زندگی کے آخر تک رہا، کبھی کبھی جب مولانا کی یاد آتی تھی تو ایک آدھ خط بھی اڑا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا آزاد کلکتہ کارپوریشن کے ''میئر'' یا ''ایلڈرمین'' ہوگئے تھے، اخبار میں یہ خبر پڑھی تو ان کو خود مبارک باد کا خط لکھا، لیکن مولانا کو اس سے سخت انقباض ہوا لکھا کہ:

> ''میں نے کوئی اچھا مضمون لکھا ہوتا، یا کوئی علمی کارنامہ انجام دیا ہوتا، تو آپ مبارک باد دیتے تو ایک حد تک زیبا تھا، اس منصب کی جو مجھے کارپوریشن نے بخشا ہے، میری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں ہے، جس پر مجھ کو مبارک باد دی جائے، لیکن بہرحال آپ کے اس اخلاص اور تعلق خاطر کا شکریہ ادا کرنا بہت ضروری ہے''

بالکل آخر زندگی میں ایک مرتبہ اپنی کتاب ''حکمائے اسلام'' کو لے کر ان سے ملنے کے لئے دہلی جانے والے تھے، مگر ارادہ ہی کر کے رہ گئے، اور نہ جاسکے، دارالمصنفین میں آنے کے بعد نہ کبھی اعظم گڑھ سے نکلنے کا اتفاق ہوا، نہ مولانا سے ان کی ملاقات ہو سکی، مگر وہ تمام عمر ان کی ادبی عظمت کے قائل تھے، اور ان کے ذکر سے لذت اندوز ہوتے تھے، اگرچہ ان کا کوئی سیاسی مسلک نہیں تھا، اور نہ سیاست سے کوئی دلچسپی تھی، نہ اس موضوع پر کبھی گفتگو کرنا پسند کرتے تھے، تاہم وہ مولانا کے سیاسی عقیدہ وفکر سے ہم آہنگ نہیں تھے، اور نہ کھدّر یا ملکی مصنوعات کے استعمال کے بہت زیادہ قائل تھے ایک زمانہ میں پورا دارالمصنفین کھدّر پوش ہوگیا، لیکن اس زمانہ میں بھی انہوں نے عام روش کی

تقلید نہیں کی اور کھدر نہیں پہنا۔

وضع داری بشرط استواری اصل ایماں ہے

ایک زمانہ میں ان کو ریاح بواسیری کی شکایت ہو گئی تھی، یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے، اور سمجھتے تھے کہ اگر خوبی قسمت سے اچھے بھی ہو گئے تو کام کرنے کے قابل نہیں رہیں گے، اگر اس حالت میں ارباب دارالمصنفین الگ کر دیں گے، تو اس پیرانہ سالی میں بے کاری کا زمانہ سخت عسرت اور تنگدستی میں بسر ہوگا، وہ اسی فکر میں تھے، کہ گورنمنٹ کے اس فنڈ کا کسی ذریعہ سے ان کو پتہ چلا، جو اس نے انہی کے الفاظ میں درماندہ و شکستہ مصنفین و ادباء و شعراء کی امداد کے لئے قائم کیا تھا، انہوں نے خفیہ اس سلسلہ میں گورنمنٹ سے خط و کتابت کی، لیکن بعض شرائط کے پورے نہ ہونے کی وجہ سے جن میں ایک غالبًا یہ تھی، کہ درخواست دہندہ کے کوئی اولاد نرینہ نہ ہو، ان کی درخواست منظور نہیں ہوئی۔ یہ خط و کتابت چونکہ دفتر ہی کے ذریعہ ہوئی تھی، اس لئے یحییٰ اعظمی کو اس سے فائدہ اٹھانے کا خوب موقع مل گیا، وہ ایک عرصہ سے مولانا ابوالکلام کی مدح میں لکھتے چلے آ رہے تھے، اس تقریب سے انہوں نے درخواست دی تو فوراً منظور ہو گئی اور بے سان و گمان تا حیات ڈیڑھ سو ماہوار ان کا وظیفہ مقرر ہو گیا، حالانکہ ان کے بھی ایک اولاد نرینہ موجود تھی اور دارالمصنفین کے دفتر سے بھی تعلق تھا، البتہ یہ رقم گھٹ کر سو ہو گئی جو ان کی زندگی بلکہ وفات کے ایک مہینہ بعد تک ملتی رہی، اس فنڈ کا تعلق تمام تر مولانا ابوالکلام کی وزارت تعلیم سے تھا، جس کے سیکرٹری خواجہ غلام السیدین جیسے ماہر تعلیم، اہل علم اور مصنف تھے، اگر مولانا نے ذرا بھی توجہ فرمائی ہوتی، تو مولانا عبدالسلام صاحب کو ان کی شاندار علمی و ادبی خدمات پر وظیفہ ضرور مل جاتا، وہ مستحق بھی تھے، اور ضرورت مند بھی، مولانا کو اپنی اس ناکامیابی کا ذرہ برابر غم نہیں ہوا، لیکن ہم نیازمندوں کو اس کا سخت افسوس ہوا۔

لیکن ان کا یہ خیال کہ ضعف یا بیماری کی وجہ سے وہ دارالمصنفین سے خدانخواستہ علیحدہ کر دیے جائیں گے، محض وہم تھا۔ اس لئے کہ جن اقانیم ثلثہ سے دارالمصنفین اس وقت عبارت تھا، ان میں ایک مولانا عبدالسلام بھی تھے، اور پھر وہ مولانا شبلی کے ادبی

جانشین سمجھے جاتے تھے، اس لئے ان کے علیحدہ کئے جانے کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اگر خدانخواستہ پیدا بھی ہو جاتا تو ''دارالمصنفین'' کا لفظ بے معنی ہو جاتا، اور مولانا شبلی کی روح کو اس سے سخت تکلیف پہنچتی۔ وہ اپنی وفات کے دن تک جو بالکل اچانک ہوگئی تھی، اس سے وابستہ رہے اور تصنیف و تالیف اور معارف کے لیے گوناگوں موضوعات پر مضامین لکھنے میں مصروف رہے۔

وہ لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ کی طرح اخلاقِ اسلامی کی ایک مکمل تاریخ لکھ رہے تھے، اور اس کے لئے اچھا خاصا مواد بھی اکھٹا کر لیا تھا، لیکن ان کے اچانک انتقال سے وہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی، صرف اس کی ایک ہی جلد شائع ہو کر رہ گئی، وہ اگر مکمل ہوگئی ہوتی، تو ان کا بڑا یادگار علمی کارنامہ ہوتا۔

مولانا کو جب ریاح بواسیری سے، جس نے ان کو شدید انتشار فکر میں مبتلا کر دیا تھا، نجات مل گئی، اور ان کو اپنی صحت کی طرف سے پورا اطمینان ہوگیا، اور یہ یقین ہوگیا کہ وہ بحمد اللہ پہلے ہی کی طرح کام کرنے کے قابل ہو گئے، تو انہوں نے مولانا ابوالکلام کو ایک بہت مفصل خط لکھا، کہ میں نے اپنی زیر تالیف حکمائے اسلام جلد دوم، شعرالعرب، تاریخ التنقید، تاریخ اخلاق اسلامی جلد دوم کے مسودوں پر نظر ثانی شروع کر دی ہے، حکمائے اسلام جلد دوم چھپ رہی ہے اور اس کی کاپی اور پروف پڑھ رہا ہوں، یہ چھپ جائے تو دونوں جلدیں ایک ساتھ آپ کی خدمت میں بھیجوں۔

اس خط کے لکھنے کا کیا منشا تھا اور اپنے مشاغل علمیہ کی تفصیل لکھ کر ان کو کیوں بھیجی، ہم اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں،

وزارت تعلیم کے زمانہ میں مُلک کے اہلِ علم و ادب مولانا ابوالکلام کو جو خطوط لکھتے تھے، ان کا جواب وہ اپنے پرائیویٹ سیکرٹری اجمل خاں سے لکھواتے تھے، خود نہیں لکھتے تھے۔ اجمل خاں نے مولانا کی وفات کے بعد یہ تمام خطوط کتابی صورت میں جمع کر دیے ہیں، جس سے اُردو کے ادبی ذخیرہ میں ایک بیش قیمت چیز کا اضافہ ہوگیا ہے، اس میں مولانا عبدالسّلام صاحب کا مذکورہ بالا خط بھی ہے، ہم ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے ذیل میں درج کرتے ہیں:

''مکرمی السلام علیکم،

مدت سے آپ مجھ سے بے خبر ہیں، لیکن میں آپ سے بے خبر نہیں ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ درمیان سے بے خبری کا پردہ اُٹھ جائے، لکھنؤ میں ریاحِ بواسیری کی جو شکایت پیدا ہوگئی تھی، اس نے پیرانہ سالی میں غایت شدت اختیار کر لی ہے، یہاں تک کہ گذشتہ دنوں میں مجھ کو زندگی سے مایوسی سی پیدا ہوگئی، کچھ دنوں تو موت کا انتظار کرتا رہا، جب وہ نہ آئی اور اطباء نے بھی یقین دلایا کہ ابھی وہ نہ آئے گی، تو کم از کم یہ خطرہ تو ضرور پیدا ہوا کہ اب لکھنے پڑھنے کے قابل نہ رہوں گا اور پیرانہ سالی میں بیکاری کا یہ زمانہ سخت عسرت میں بسر ہوگا، اس لیے گورنمنٹ آف انڈیا نے درماندہ اور پاشکستہ مصنفین کی امداد کے لیے جو فنڈ قائم کیا ہے، اس پر مجبورانہ نگاہ پڑی اور میں نے ایک درخواست کی، جو افسوس کہ نامنظور ہوئی، لیکن اربابِ دارالمصنفین نے میری طویل ادبی و علمی خدمات کا لحاظ کیا اور باوجود بے کاری کے دارالمصنفین سے الگ نہیں کیا، اور مجھے یہ معلوم کر کے بڑی خوشی ہوئی کہ اس قدردانی میں آپ کا اشارہ تائید کر رہا تھا، لیکن اب میں کسی قدر کام کرنے کے قابل ہوگیا ہوں، اور اپنے گذشتہ لکھے ہوئے مسودات میں حکمائے اسلام جلد دوم، شعر العرب، تاریخ التنقید، تاریخ اخلاق اسلامی جلد دوم پر نظر ثانی کر رہا ہوں، اور حکمائے اسلام جلد دوم چھپ رہی ہے اس کی کاپی اور پروف پڑھ رہا ہوں، چھپ جائے تو حکمائے اسلام جلد اول و حکمائے اسلام جلد دوم آپ کی خدمت میں بھیج دوں۔

میرا دماغ فلسفیانہ واقع ہوا ہے، تاریخ اخلاق اسلامی جلد دوم میں فلسفیانہ مباحث سامنے آئے ہیں کہ مسلمانوں کے اخلاق پر مختلف علوم وفنون، مثلاً فلسفہ، حدیث، فقہ کا کیا اثر ڈالا۔ معتزلہ، خوارج، اشاعرہ، شیعہ وغیرہ کے اخلاق کو کس قدر متاثر کیا، مبتدعانہ مقامات، عرس و زیارت مثلاً اجمیر وغیرہ نے مسلمانوں کے اخلاق میں کوئی تبدیلی پیدا کی، اور مسلمانوں کی تاریخیں اور اُن کے تذکرے اس کا تشفی بخش جواب نہیں دیتے ہیں

میری مدت سے یہ خواہش ہے کہ آپ سے مل کر اس قسم کے مباحث پر گفتگو کروں، لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ اوّلاً تو آپ کی ملاقات ہی بمشکل ہوسکتی ہے، اگر چند منٹ

کی ملاقات ہو بھی جائے تو اس قسم کے دماغ پاش مسائل پر بحث کا وقت نہیں مل سکے گا۔

غالباً اس خط سے آپ کو یہ معلوم ہوگا، کہ میرا دماغ صحیح حالت میں ہے اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف، یہ میں نے اس لیے لکھا ہے کہ بعض لوگوں کو میری دماغی صحت پر شک ہے۔

والسّلام

عبدالسّلام ندوی

شبلی منزل، اعظم گڈھ

۱۱ جنوری ۱۹۵۶ء

مولانا نے اتنے بڑے اُردو کے مصنف اور اپنے ہفتہ وار الہلال کے ایک اہم شریک ادارت کے خط کا جواب بھی اپنی نامعلوم مصروفیت کی وجہ سے خود اپنے قلم سے نہیں دیا، اپنے پرائیویٹ سیکرٹری اجمل خاں سے دلوایا، وہ بھی محض دو سطروں میں، حالانکہ مولانا جیسے ایک درجن معیاری کتابوں کے مصنف کو جو ان کا مرکز عقیدت، مولانا شبلی کا ادبی جانشین اور دارالمصنفین جیسے علمی ادارہ کا ایک اہم اور فعال رکن بھی تھا، مولانا ابوالکلام کو اپنے قلم سے جواب لکھنا چاہیے تھا، جو ان کی اور تحریروں کی طرح یہ بھی ان کی ادبی یادگار بن جاتا، مگر افسوس کہ مولانا کی حیرت انگیز مصروفیت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ جواب اجمل خاں کے قلم سے:

مکرمی! تسلیم

مولانا کو آپ کا خط ملا، ناسازی مزاج کا حال معلوم ہوا، فرماتے ہیں کہ ''بہت دن ہوئے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی، انہیں خوشی ہوگی، اگر آپ دہلی آئیں اور ملیں۔

......☆......☆......☆......

حاشیہ:

(۱) الہلال میں مولانا عبدالسلام ندوی کا مضمون ''الاعتصاب فی الاسلام'' کے عنوان سے چار قسطوں میں چھپا تھا۔ اس کی تین قسطوں کو پڑھ کر ایک تنقید مولانا شبیر احمد عثمانی نے کی تھی۔ اس کا جواب مولانا ندوی نے ایک ہی مضمون میں دیا تھا، جس کی ایک ہی قسط تھی۔ تفصیل یہ ہے:

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قابض انتظامیہ کے خلاف طلبہ نے اسٹرائیک کردی۔ انتظامیہ نے طلبہ کے رویے کے خلاف الہلال میں اظہار خیال کیا، طلبہ نے اپنا موقف پیش کیا۔ انتظامیہ نے طلبہ کے رویے کو اسلام کے خلاف ٹھہرایا تھا۔ یہ ہتھیار ملک کی رائے کو ان کے خلاف بھڑکانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ (اس سلسلے میں شذرات، مقالات، اخبار، اطلاعات، مراسلات اور دیگر معلومات و مباحث کے لیے دیکھیے الہلال کے شمارہ جات ۱۴/ و ۲۸/ جنوری، ۴/، ۱۱/ فروری، ۴+۱۱/ (مشترکہ شمارہ)، ۱۸/، ۲۵/ مارچ اور یکم، ۸/، ۱۵+۲۲/ (مشترکہ شمارہ) و ۲۹/ اپریل ۱۹۱۴ء)

جب اغراض کی پردہ پوشی کے لیے اسلام کو آڑ بنایا گیا تو اسلامی تعلیمات کی وضاحت کے لیے مولانا عبدالسلام ندوی نے ''الاعتصاب فی الاسلام'' کے عنوان سے نہایت مدلل، فکر انگیز اور مفصل مضمون ۲۹/ جولائی و ۵/، ۱۲/، اور ۱۹/ + ۲۶/ اگست ۱۹۱۴ء کی چار قسطوں میں ایک مضمون لکھا، انتظامیہ کی مدد کے لیے، طلبہ کی مخالفت اور مولانا ندوی کے رد میں جہاد عظیم کے لیے مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے کنج عافیت سے سر نکالا اور بڑے غرور و تحکم کے ساتھ ایک مضمون لکھا جو اسی عنوان سے المراسلۃ والمناظرہ کے کالم میں ۱۹ + ۲۶/ اگست کے مشترکہ شمارۂ الہلال میں چھپا۔ اس کا شافی جواب اسی کالم میں اور اسی عنوان سے ۳۰/ ستمبر ۱۹۱۴ء کے الہلال میں شایع ہوا۔ حضرت سید سلیمان ندوی نے مولانا عثمانی کے انتقال پر جو تعزیتی مضمون میں لکھا تھا، اس میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''۱۴-۱۹۱۳ء کی بات ہے کہ ندوہ میں مولانا شبلی کے استعفے پر ایک عظیم الشان اسٹرائیک ہوئی تھی، جس میں علی گڑھ اور دیوبند وغیرہ ندوہ کے اہل اہتمام کے ساتھ تھے اور ملک و قوم کے آزاد اخبارات مولانا ابوالکلام کی رہنمائی میں طلبہ کی تائید میں تھے۔ اس وقت مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کا ایک مضمون ''الاعتصاب فی الاسلام'' کے عنوان سے الہلال میں نکلا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا شبیر احمد صاحب کا مضمون اسی الہلال میں نکلا تھا، جس میں اسٹرائیک کو خلاف اصول بتایا تھا..... پھر جب دیوبند کے احاطے تک اسٹرائیکوں کا سیلاب آ پہنچا تو ان کا یہ مضمون مجھے یاد آیا۔''

(یادرفتگان: ص ۴۴۸)

دیوبند میں یہ اسٹرائیک جس کی طرف سید صاحب نے اشارہ کیا ہے ۱۹۲۷ء میں ہوئی تھی اور اس کے نتیجے میں طلبہ اور اساتذہ کی ایک جماعت کو مولانا شبیر احمد عثمانی ڈابھیل (سورت) لے گئے تھے۔

۲ جنوری ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان کی عارضی حکومت میں مولانا شریک ہوئے تو ان کی سیاسی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا تھا اور اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کا جو زمانہ اس زندگی کا حصہ بنا وہ انتہائی ہنگامہ خیز اور انتہائی مصروفیت کا دور تھا، جس میں نہ صرف انھیں بلکہ تمام رفقاے سیاست کو سر پیر کا ہوش نہ تھا اور ان کی وفات تک کم و بیش حالات کی یہی ستم ظریفی رہی۔ مولانا آزاد کی مصروفیات بہت ہوگئی تھیں اور اہل وطن اور بیرون وطن کے لوگوں کا رجوع بہت بڑھ گیا تھا۔ اس زمانے میں مولانا کا اپنی ڈاک کو خود دیکھنا اور خود جواب دینا ممکن نہیں رہا تھا۔ ان کے سیکریٹری ڈاک دیکھتے اور لائق جواب خطوط ایک فایل میں رکھ کر مولانا کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ بعض اوقات مولانا انھیں دیکھنے کے لیے رکھ لیتے تھے اور پھر کسی وقت انھیں دیکھ کر انھی خطوط پر جواب کا مختصر مضمون لکھ دیتے تھے اور ان کے سیکریٹری مولانا کے جوابی جملوں کو خط کی مکمل شکل دے کر مکتوب نگاروں اور مستفسروں کو بھیج دیتے تھے۔ بعض اوقات ان کے سامنے خطوط کا فایل پیش کیا جاتا تو سیکریٹری ان خطوط کے مطالب مولانا کو سناتے یا بتا دیتے اور مولانا اس کا جواب زبانی ارشاد فرما دیتے۔ سیکرٹری اسے خط پر نوٹ کر لیتے۔ اجمل خان اس مقصد کے لیے ڈایری بھی استعمال کرتے تھے بعد میں یہ جوابات بھی خطوط کی شکل میں متعلقین کو روانہ کر دیے جاتے تھے۔

اس زمانے میں مولانا اپنے قلم سے بہت کم جواب دیتے تھے۔ محترم مضمون نگار کا یہ شکوہ شکوہ بے جا نہیں ہے۔ اگر حالات پر نظر نہ ہو تو یہ شکایت مولانا کے دوسرے احباب، اعزا، نیاز مندانِ شوق اور عقیدت کیشان وقت کو بھی ہو سکتی ہے! مثلاً مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا غلام رسول مہر، شورش کاشمیری، محمد یونس خالدی وغیرہم۔ ڈاکٹر ریاض الرحمٰن خاں شروانی کے ساتھ تو اجمل خاں صاحب نے یہ ظلم روا رکھا کہ ان کا خط بھی مولانا کی خدمت میں

پیش نہ کیا اور اپنی طرف سے جواب لکھ دیا۔ لیکن اس کا شکوہ کبھی ان حضرات کی زبان پر نہ آیا۔ اگر ان کا بھی کوئی جانشین یا عقیدت مند ایسا ہوتا تو وہ شکوہ کر سکتا تھا۔ مجھے تو اس سے بھی بڑھ کر تعجب اس بات پر ہے کہ مولانا نے اپنے "صدیق مکرم" کے انتقال کی خبر سن کر یا اطلاع پا کر ان کے خلف الرشید مولانا عبید الرحمٰن خاں شروانی، جن کی حیثیت صرف اپنے والد کے جانشینِ علم و تہذیب ہی کی نہ تھی، وہ خود بھی کئی حیثیتوں کے مالک تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے خازن اور پرو وایس چانسلر رہے تھے۔ لیکن مولانا نے انھیں تعزیت کے دو جملے بھی اپنے قلم سے نہیں لکھے، مولانا چاہتے تو انھیں فون ہی کر سکتے تھے۔ تعزیت کا جو تار دیا تھا کیا تعجب کہ وہ بھی کسی سیکریٹری کے توجہ دلانے پر دیا ہو یا اس نے اپنے ہی طور پر دے دیا ہو۔ میں نے سوچا کہ میں بھی مولانا کی ترک وضع داری، بے وفائی، احباب فراموشی یا اس قدر دشمن اربابِ وفا ہو جانا۔ میں ابو علی اعظمی صاحب کا شریک شکوہ سنجی ہو جاؤں، لیکن خیال آیا کہ پہلے مجھے ان کی عمر، صحت اور ان کے حالات میں ان کی پریشانیوں کا جایزہ لینا اور ان کی معذرت تلاش کرنی چاہیے۔

جو شکایت محترم ابو علی اعظمی کو پیدا ہوئی تھی، ایسی ہی ایک شکایت ان کے دوست جناب ماہر القادری صاحب ایڈیٹر فاران کراچی کو بھی پیدا ہوئی تھی۔ ان کی شکایت کی بنیاد یہ تھی کہ انھوں نے ایک خط رجسٹری مولانا آزاد کو بھیجا تھا اور پھر انھوں نے یقین کر لیا کہ وہ خط مولانا کو مل گیا، مولانا سے اس کا جواب بن نہیں پڑا اور یہ بھی فرض کر لیا کہ مولانا پر فرض تھا کہ وہ ماہر القادری صاحب کے خط کا جواب دیں اور اس فرض کی ادائیگی سے مولانا نے جان بوجھ کر اعراض برتا تھا۔ اس لیے مولانا ان کے مجرم ٹھیرے تھے۔ اور اس کے بعد انھیں یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ ان کے خلاف مضمون چھاپ دیں!

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں محترم ابو علی اعظمی صاحب اور جناب ماہر القادری صاحب-- دونوں سے ہم دردی ہے۔

اجمل خاں کے مرتبہ مولانا کے جس مجموعۂ خطوط کا ذکر آیا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ خان صاحب نے مولانا آزاد کے نام خطوط اور ان سے استفسارات کے جوابات پر مشتمل دو مجموعے مرتب کیے تھے اور

۱۔ملفوظات آزاد--مولانا کے نام مذہبی استفسارات اور ان کے جوابات اور
۲۔مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط اور ان کے جوابات کے نام سے دہلی سے شایع کر دیے تھے۔
ان دونوں مجموعوں کے جوابات کو تکمیل، تصحیح اور اضافے کے ساتھ ''ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان'' (کراچی) کے زیر اہتمام مرتب کر کے ''افادات آزاد'' کے نام سے چھاپ دیا گیا تھا۔اس کا دوسرا ایڈیشن ''مطبوعات آزاد صدی'' کے سلسلے میں مزید تصحیح و اہتمام کے ساتھ شایع ہوا تھا۔افادات آزاد کا مقدمہ محمد اجمل خان کے قلم سے یادگار ہے۔(ا۔س۔ش)

مولانا ابوالکلام آزاد
اور
مولانا عبدالماجد دریابادی

آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کو قلعۂ احمد نگر جیل سے نامعلوم مصلحت کی بناء پر بنگال کے بانکوڑہ جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا، وہیں آپ کو شملہ کی ویول کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا اور آپ اس کانفرنس میں شرکت کے لئے وہیں سے شملہ روانہ ہو گیے۔ اس کانفرنس کے دوران تک وہیں مقیم رہے، احمد نگر جیل میں، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو عام خیال میں مخاطب کر کے جو خطوط لکھے تھے، ان کے پرائیویٹ سیکرٹری جناب اجمل خان کے اصرار سے وہیں مرتب کیئے گئے اور وہیں سے ان کا مسودہ پریس کے حوالہ کیا گیا اور شائد اس کا پہلا اڈیشن زمزم پریس لاہور سے شائع ہوا، اس میں ایک خط جو تمام تر علم موسیقی اور خود مولانا کی اس فن سے عملی دلچسپی سے متعلق تھا، وہ اس کے دوسرے اڈیشن میں شامل کیا گیا۔ مولانا کے ان خطوط کے علاوہ کچھ خطوط سیاسی آدمیوں کو بھی لکھے تھے وہ الگ کر لئے گئے تھے کہ وہ بعد کو کسی مناسب موقع پر مجموعہ کی شکل میں شائع کیے جائیں گے لیکن وہ شائع ہونے سے رہ گئے، خدا ہی بہتر جانتا ہے، کہ وہ اب محفوظ ہیں یا ضائع ہو گئے۔ مولانا ہمیشہ اپنے نگارشات قلم کی حفاظت کی طرف سے بے نیاز رہے، ان کے قلم کا کتنا سرمایہ، جو اردو ادب و زبان کے لئے مایۂ فخر ہوتا، ان کی شان بے نیازی سے

ضائع ہو گیا۔

بانکوڑہ جیل سے رہا ہونے اور شملہ کانفرنس سے فرصت پانے کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کو کہیں مولانا کی تصویر نظر آ گئی۔ اس کو دیکھ کر اپنے صدق جدید میں اپنے خاص طرزِ انشاء میں جو تاثرات قلم بند کئے ہیں آپ ملاحظہ فرمائیں، تصویر دیکھتے ہی تمام پچھلی یادیں تازہ ہو گئی ہیں۔ ایک ایک کو یاد کر رہے ہیں اور مزے لے رہے ہیں۔

لکھنؤ کے باغ و بہار میں ان کو جو کبھی ایک کشیدہ قامت، خوش رو، نوجوان نظر آیا تھا۔ سیاہ شیروانی اور سیاہ ایرانی ٹوپی میں ملبوس، سگریٹ آج بھی کل کی طرح رفیق، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہوئی، چہرہ پر متانت برستی ہوئی، آہ وہی تصویر میں اس وقت اس حالت میں نظر آیا، تھکا ہوا چہرہ، چہرہ پر ضعیفی کے آثار، آنکھوں پر عینک، بال سیاہ سے زاید سفید، ایک ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ، جسم آرام کرسی سے لگا ہوا، پشت اور گردن کرسی کے تکیہ کا سہارا لئے ہوئے، گویا سیاسی میدان جنگ میں ذرہ کی ذرہ ستانے لیٹا ہے۔

دیکھا اور دیکھ کر بے قرار ہو گئے

کاش کوئی صورت ایسی ہوتی، کہ زندگی کا کھیل پھر سے شروع کیا جا سکتا ہے۔ ضعف اور بڑھاپے کی جھریاں، رعنائیوں میں تبدیل ہو جاتیں۔ گئی بہار پھر لوٹ آتی، مگر وقت جو گزر گیا، کہاں واپس آ سکتا ہے، جو دن بیت گئے وہ کہاں لوٹ سکتے ہیں، جو زمانہ گزر گیا، وہ کہاں پھر آ سکتا ہے۔

زمانہ دگر گونہ آئیں نہاد

ابوالکلام ایک سیاست دان ہی نہیں، ایک جماعت قومی کا صدر ہی نہیں، ایک عظیم قائد ہی نہیں، ایثار و قربانی کی ایک مجسم مثال ہی نہیں، علم و ادب کا امام ہے۔ قرآن کے علوم و معارف کا راز دان ہے، اسرار شریعت کا پردہ کشا ہے، ہندوستان میں تنہا اسی کی ذات ہے، جس نے لوگوں کو قرآن کی طرف متوجہ کیا، مولانا محمد علی نے اگر یہ کہا تو بالکل صحیح کہا، کہ اسلام میں نے دو بزرگوں سے سیکھا، ایک شکوہ، جواب شکوہ کے مصنف اقبال سے، اور دوسرے الہلال کے مدیر مسئول مولانا ابوالکلام آزاد سے ہماری زبان سے مشہور روزگار شاعر حسرت نے ایک زمانہ میں مولانا کی اردو انشاء پردازی کے متعلق فرمایا

تھا، اور کیا خوب فرمایا تھا:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا!

مولانا سیاسی وملی وقومی جو خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں، مورخ ان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا، ادھر ۳۰، ۳۵ برسوں کی اکثر تحریکوں کی زمام قیادت ان کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ جنگ طرابلس، غزوۂ بلقان، ہنگامہ مسجد کانپور، اور تحریک خلافت وتحریک ترک موالات کے تو وہ ہیرو تھے، اور تنہا انہی کی آواز پر پورا ہندوستان لوائے خلافت کے نیچے آ گیا تھے۔ یہ وہ حقائق ہیں، جن سے انکار کرنے کی شاید ہی کسی کو جرأت ہو۔

وطنی سیاست کی طرف مولانا شبلی کے بعد، سب سے پہلے مسلمانوں کو انہی نے متوجہ کیا، اور اس میں بہت جلد ممتاز مقام حاصل کر لیا، اور ۱۹۲۳ء کے کانگریس کے اسپیشل اجلاس منعقدہ دہلی کے بالاتفاق صدر منتخب ہو گئے، جو اس زمانہ میں ایک بہت بڑا قومی اعزاز تھا۔ رفتہ رفتہ مولانا نے گاندھی جی اور کانگریس کا اتنا زبردست اعتماد حاصل کر لیا۔ ۱۹۴۰ء میں کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ رام گڑھ (بہار) کے صدر منتخب ہو گئے اور اسی رانچی روڈ پر جہاں سے کبھی ایک سیاسی قیدی کی حیثیت سے گزرے تھے، قوم نے ان کا شاہانہ استقبال کیا، یہ وہ شرف ہے، جو بہت کم خوش نصیبوں کے حصہ میں آتا ہے، مرہٹہ قوم کے مشہور فدائے وطن وملک کو قوم یہ تاج عزت وکرامت پہناتی ہی رہ گئی، اور وہ دنیا سے چل بسے، اسی طرح راج گوپال اچاریہ کو اپنی طویل قومی وسیاسی خدمات اور قربانیوں کے باوجود زندگی کے آخر تک یہ اعزاز حاصل نہ ہو سکا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

بہر حال اب کے سربراہ کانگریس ہونے کے بعد ہندوستان کی قومی زندگی کی بھٹی جو بھڑکی تو اب تک نہ بجھ سکی، ۹- اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کو حکومت نے ان تمام ہاتھوں کو

بیک وقت معطل کر دیا، جو اس بھٹی کو ہوا دے سکتے تھے اور ۲۴ - گھنٹہ کے اندر نہ صرف بمبئی بلکہ پورے ہندوستان میں جہاں بھی چھوٹے بڑے کارکن تھے، وہ سب گرفتار کر لئے گئے۔ اور نامعلوم مدت تک کے لئے جیلوں میں بھر دیے گئے۔ حکومت کا خیال تھا کہ ہندوستان گیر گرفتاریوں اور قید و بند سے یہ آگ سرد ہو جائے گی، مگر کیا ہوا، دنیا نے دیکھا کہ بجائے ٹھنڈی ہونے کے اور بجھ جانے کے اور زیادہ گرم اور شعلہ زن ہو گئی اور اس قدر بے پناہ ہو گئی کہ اگر اب ایک ہاتھ بھی باقی نہ رہے، جو اس کو ہوا دے سکتا ہو، تب بھی یہ آگ مشتعل اور بھڑکتی رہے گی۔ اس آگ سے اب ہر ہندوستانی کا سینہ گرم ہے، ہماری سوئی ہوئی قوم نے کروٹ لے لی ہے۔ افراد کی طرح قومیں بھی جب غفلت سے بیدار ہوتی ہیں، تو پہلے آنکھیں ملتی ہیں، پھر کروٹ بدلتی ہیں، پھر چلنے اور دوڑنے لگتی ہیں، ہندوستان ان تمام منزلوں سے گزر چکا ہے۔ اب وہ تیزی سے آزادی کی طرف بڑھ رہا ہے، اب سمندر کی ساری لہریں اسے بہا نہیں سکتیں۔ پہاڑوں کی بلند چوٹیاں اس کی راہ کو روک نہیں سکتیں اور آسمان کی ساری بجلیاں اسے تہا نہیں کر سکتیں۔ اب ہندوستان بیدار ہو چکا ہے اور منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہے، دنیا کی کوئی طاقت اس کا راستہ نہیں روک سکتی اس بھٹی کے گرم رکھنے میں مولانا کی آتش نوائی اور دانش مندی کو بڑا دخل ہے۔

کانگریس کی زمام قیادت جب سے آپ کے ہاتھوں میں آئی ہے۔ وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آپ نے جس وقت قوم کی اس امانت کو لینے کے لئے رام گڑھ میں قدم رکھا ہے۔ انقلاب آپ کے جلو میں تھا، اجلاس ابھی شروع بھی نہیں ہوا تھا، کہ اس زور سے پانی کا طوفان آیا کہ چشم زدن میں پورا پنڈال تہ آب آ گیا۔ ۲۴ گھنٹہ تک مسلسل موسلا دھار بارش ہوتی رہی، کسی طرح پانی رکنے اور ابر کھلنے پر نہ آیا۔ رام گڑھ کانگریس کی یہ خصوصیت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی، کہ صرف ایک ریزولیشن پیش ہوا اور وہ بھی برستے ہوئے بادل کے نیچے اور بہتے ہوئے پانی کے اوپر پاس کیا گیا گویا یہ دیباچہ تھا اس انقلاب کا جو ۱۹۴۲ء میں پورے جوش و خروش کے ساتھ آنے والا تھا اور جب وہ آیا تو پورا ملک زیروزبر ہو گیا۔

ایک طرف بے قابو اور غیر منظم عوام تھے، دوسری طرف حکومت کی قہرمانی طاقتیں! حکومت گو کامیاب ہوئی اور اس نے سمجھا کہ قومی زندگی کی بھٹی ہمیشہ کے لئے سرد ہوگئی، لیکن اس کا خیال غلط نکلا، وہ اب بھی بڑی تیزی سے فروزاں ہے۔ عوام کے قلوب میں آگ لگی ہوئی ہے اور یہ فیض ہے مولانا کی صدارت کا، اور قومی زندگی سے ان کی والہانہ شیفتگی کا۔

متع اللّٰہ الاسلام والمسلمین والوطن بطول بقائہ

اللہ نے ان کو جو ذہانت، بصیرت اور جرأت بخشی ہے، وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ الہلال کی چار سال کی جلدیں اس کی شاہد عدل ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادی سے زیادہ ان کا قدر دان اور عظمت شناس کون ہوسکتا ہے۔ ایک ہی ادیب دوراں کے دونوں خواجہ تاش ہیں اور ایک ہی خرمنِ کمال کے دونوں خوشہ چیں ہیں، مولانا شبلی کی بارگاہ علمی میں دونوں کا گزر تھا۔ ایک فیض صحبت سے ادیب وفلسفی ہوگیا، دوسرا انشا پرداز اور تدبر وسیاست کا امام، ایک نے مشرقی علوم وفنون کے احیاء کا علم بلند کیا، اور دوسرے نے مغربی فلاسفہ وحکماء سے اردو دان طبقہ کو روشناس کیا، ایک کی اس دور کی ادبی یادگار الہلال کی جلدیں ہیں، اور دوسرے کی فلسفہ جذبات اور تاریخ اخلاق یورپ وغیرہ۔ پھر شدت ہم ذوقی نے دونوں کو یکے بعد دیگرے قرآن کا خادم بنادیا، اگر ایک کی تفسیر ترجمان القرآن بے مثال ہے تو دوسرے کا انگریزی و اردو ترجمہ قرآن، اس کی تفسیر اس کے حواشی اور نوٹ دوسرے درجہ کی چیز نہیں۔

اسلام کے دیوانے دونوں ہیں اور مقصد زندگی بھی دونوں کا ایک! اور وہ ہے مسلمانوں کی خدمت! لیکن راہیں مختلف، ایک کانگریس کی راہ سے مسلمانوں کی خدمت کر رہا ہے اور دوسرا ہر قسم کے ہنگاموں سے یکسو ہوکر خالص علمی طریقہ سے مسلمانوں کے دل و دماغ کی اصلاح کر رہا ہے۔ ایک انگریز کی پُرکید سیاست سے مسلمانوں کو خبردار کر رہا ہے اور دوسرا یورپ کے تمدنی، تہذیبی ومعاشرتی غلبہ سے ان کو بچا رہا ہے، بہرحال مسلم قوم ان کے احسانات سے کبھی سبک دوش نہیں ہوسکتی، دونوں ہی کی اس کو ضرورت ہے، اور

دونوں کی ذہنی وفکری قوتیں بے پناہ ہیں۔

عرصہ کی بات ہے، کہ الہلال ہی کے صفحات میں مولانا آزاد اور علامہ دریابادی کے درمیان لذت والم اور حظ وکرب کے اضداد پر ایک ادبی ولغوی معرکہ ہوا تھا، جو اس قدر دلچسپ تھا کہ ارباب ادب اب تک اس کے مزے لے رہے ہیں، دونوں الگ طرز انشا اور اسلوب نگارش کے مالک ہیں، ان میں سے ایک کا تتبع تو آسان ہے، لیکن دوسرے کا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے، وہی اس کا موجد تھا، اور اسی کی ذات پر وہ ختم بھی ہوگیا، جس میں بڑی رفعت، بلندی اور زور تھا، اس کے قلم نے شبلی کی بلندی، حالی کی سادگی، آزاد کی رنگینی، اور نذیر احمد کا بانکپن، بیک وقت جمع کرلیا تھا، اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ اردو کے وہ عناصر خمسہ کا قائم مقام ہے، تو شائد بے جانہ ہوگا، الہلال ایک ادبی صحیفہ ہونے کے ساتھ اپنے دور کی تمام ملی وقومی وسیاسی وتعلیمی اور علمی تحریکوں کی انسائیکلو پیڈیا ہے، اس نے اپنی چار سال کی عمر میں اردو زبان میں بہترین لٹریچر اکٹھا کردیا ہے اگر اس کی کچھ اور تصنیفات نہ بھی ہوتیں، تو چار سالہ الہلال والبلاغ کی جلدیں اس کی ادبی عظمت کے لئے کافی تھیں۔

(مکتوبہ ۱۹۴۶ء)

۱

مولانا ابوالکلام آزاد
اور
مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

یوں تو مجھے اپنے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی طالب علمی کے زمانہ میں متعدد مشاہیر علم کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، مثلاً شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب بندوی، مدرسہ عالیہ ڈھاکہ کے شعبہ عربی کے صدر مولانا عبدالماجد صاحب درس نظامیہ اور معقولات کے مشہور استاذ، صدر شعبہ عربی مدرسہ عالیہ کلکتہ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا اسلم جیراج پوری، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا ابوالحسنات ندوی، مولانا سعید انصاری، مؤلف ''سیر الانصار'' وغیرہ، ان میں ایک مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایڈیٹر ''آزاد ہند'' بھی تھے، یہ مولانا شبلی متکلم ندوی مہتمم مدرسۃ الاصلاح کے بہت عزیز شاگرد اور میرے عربی زبان وادب کے استاد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی کے مخلص دوست تھے، یہ دونوں ندوہ کی طالب علمی میں ہم عہد تھے، لیکن مولانا عبدالرزاق ندوہ کی تعلیم نامکمل چھوڑ کر، سید رشید رضا صاحب المنار کی مشہور درس گاہ الدعوۃ والارشاد میں پڑھنے لئے مصر چلے گئے اور وہیں اپنی عربی تعلیم کی تکمیل کی، اسی لئے وہ اپنے نام کے ساتھ ندوی نہیں لکھتے تھے، اور اپنے وطن ملیح آباد کی نسبت سے ملیح آبادی لکھتے تھے، یہی نسبت ان کے نام کا جزء لاینفک ہوگئی تھی، اور اسی نسبت سے برصغیر کے صحافتی وعلمی حلقہ میں مشہور ہیں پھر بھی ندوہ میں کچھ دنوں پڑھنے کی وجہ سے ان کو ندوی

برادری ہی کا ایک نمایاں اور قابل فخر سمجھا جاتا اوران پر ناز کیا جاتا ہے، وہ مصر سے فارغ ہو کر آئے، تو مولانا شبلی متکلم ندوی اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی سے ملنے کے لئے مدرسۃ الاصلاح آئے اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کے ایماء سے ہمارے درجہ کے عربی ادب کا امتحان لیا، اس میں ہم طالب علموں کو مولانائے نگرامی کے فیض تعلیم سے اور فنون کے مقابلہ میں بڑا درخور ہو گیا تھا، اور ہم بڑی سے بڑی اردو عبارت کا عربی میں ترجمہ کر ڈالتے تھے، یہاں تک کہ اساتذۂ سخن کے ان اردو اشعار کا بھی ترجمہ کرنے لگے تھے، جو زبان زد خاص و عام ہیں۔ ان میں اردو کے مشہور مرثیہ گو حضرت انیس لکھنوی کا شعراب تک یاد ہے:

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

اس شعر کا ہم نے جو ترجمہ کیا تھا، وہ ہم میں سے کسی کا بھی محفوظ نہیں رہا۔ اس لئے ہم اس امتحان میں بہت کامیاب رہے، جس کا بہت اچھا اثر لے کر مولانا عبدالرزاق گئے، کلکتہ کے دوسرے سفر کے قیام کے زمانہ میں مولانا عبدالرحمٰن نگرامی نے مدرسہ کی نسبت سے ان سے میرا تعارف کرایا تو فوراً پہچان گئے اور فرمایا کہ ہاں میں ان کو پہچانتا ہوں، ان کے درجہ کا میں نے عربی ادب میں امتحان بھی تو لیا تھا!

مولانا ابوالکلام آزاد نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کے مقابلہ میں مسجد ناخدا زکریا اسٹریٹ میں عربی کا ایک مدرسہ قائم کیا تھا، مولانا حسین احمد مدنی جو ابھی شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ساتھ مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان آئے تھے، اس کے صدر مدرس تھے اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی عربی ادب کے استاد تھے۔ میں جب تک کلکتہ میں رہا، برابر مولانا نگرامی کے ہمراہ مولانا عبدالرزاق سے ملتا رہا اور وہ مجھ سے بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے رہے۔

وہ اپنی عربی تعلیم کے سلسلہ میں تین چار سال یک لخت مصر میں رہ گئے، اس لئے اردو میں لکھنے پڑھنے کی مشق ختم ہو گئی تھی، وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد یہاں آئے، تو

ان کو پھر اردو میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، اور مشق شروع کر دی، اور اس کی ابتدا عربی مضامین اور کتابوں کے ترجمے سے کی۔ اس میں ان کو کسی قدر مشق ہوگئی تو انہوں نے کسی مصری عالم کی ''استبداد'' نام کی کتاب کا ترجمہ کیا، اور اسی نام سے انہوں نے چھپوایا، یہ اردو میں ان کے قلم کی پہلی کاوش تھی، جو منظر عام پر آئی۔ لیکن ظاہر ہے کہ اتنی جلدی ان کی تحریر میں شگفتگی نہیں پیدا ہو سکتی تھی، یہ ترجمہ بھی بہت زیادہ شگفتہ نہیں تھا، اور عبارت بھی کہیں کہیں بڑی ناہموار تھی، پہلے ہماری مجلس میں جب اس کتاب کا ذکر آتا، تو ہم کو ہنسی آجاتی اور کہتے کہ یہ فاضل مصر کیسی خراب اردو لکھتا ہے، لیکن بعد میں مشق و ممارست سے انہوں نے بڑی ترقی کی، اور رفتہ رفتہ بہت صاف ستھری رواں اور پاکیزہ اردو لکھنے لگے، بقول ایک حیدر آبادی تنقید نگار کے برابر لکھتے لکھتے اور عربی کتابوں، ناولوں، افسانوں، مضمونوں کا ترجمہ کرتے کرتے ایک خاص طرز کے مالک ہو گئے۔ بہت سادہ، دلکش، دلنشیں، اور عام فہم جس کا اب بہت سے لوگ تتبع کر رہے ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں، اور جدید عربی ادب کے بہت سے شاہکار اردو میں منتقل کئے، علامہ ابن تیمیہ کے متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا، اتنا رواں، شگفتہ اور عام فہم کہ ان پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے، ان کو عربی سے اردو میں اور اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے پر بے مثال قدرت ہو گئی تھی، رسالہ الجامعہ جو ان کی ادارت اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی میں کلکتہ میں نکلتا تھا، اس کے لئے مولانا ابوالکلام مضامین عموماً اردو میں لکھتے تھے اور یہ ان کا عربی میں ترجمہ کر کے شائع کرتے تھے، ثقافۃ الہند دہلی میں بھی مولانا کے نام سے جو مضامین شائع ہوتے ہیں، وہ تمام تر مولانا عبدالرزاق صاحب کے ترجمہ کئے ہوئے ہیں، ان کی اپنی عربی نہیں ہے۔

انہوں نے ''انسانیت موت کے دروازے پر'' کے عنوان سے ایک مضمون کا سلسلہ دوسرے دور (۱۹۲۷ء) کے الہلال میں شروع کیا تھا، اس کی ابتدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے کی تھی، الہلال کے بند ہو جانے سے یہ سلسلہ رک گیا اور مکمل نہ ہو سکا، اس کا ابتدائی حصہ ''رحلت مصطفےٰ'' کے نام سے شائع کیا تھا، یہ اردو میں

اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو بہت مقبول ہوئی اور کئی بار چھپی، یہ اردو میں اپنے موضوع کے لحاظ سے منفرد کتاب ہے۔اس سے کتب سیرۃ کے ذخیرہ میں بہت قیمتی اضافہ ہوا ہے، یہ اس قدر پرسوز اور رقت انگیز ہے، کہ اس کے پڑھنے سے موت کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

ایک مرتبہ وہ مولانا سید سلیمان ندوی اور دوسرے متعلقین دارالمصنفین سے ملنے کے لئے اعظم گڑھ آئے تھے، سر سے پاؤں تک مکلف، کلین شیو، سرخ وسفید رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑی چمکتی ہوئی پیشانی، پستہ قامت، لیکن بہت شاندار اور پرکشش، سید صاحب ان کو کتب خانہ کی سیر کراتے ہوئے، میرے کمرے میں بھی لائے اور یہ کہہ کر مجھ ناچیز کا ان سے تعارف کرایا، کہ یہ آپ کے ہم مسلک ہیں، مسکرائے اور بہت ہی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے اس وقت مجھ کو بالکل نہیں پہچانا اور میں نے بھی سید صاحب کی موجودگی میں ان سے پہلے سے تعارف اور کلکتہ میں مولانائے گرامی کے ساتھ ان سے بار بار کی ملاقات کا ذکر نہیں کیا، ورنہ اور زیادہ مجھ سے تپاک سے ملتے، ایک روز اور ایک شب رہ کر واپس لے گئے، اس درمیان میں پھر ان سے ملاقات کا اتفاق نہیں ہو سکا، یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی، اس کے بعد نہ میں اپنے وطن سے کہیں باہر گیا، وہ ان سے کہیں ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی مگر ہم مسلکی اور ہم فکری کی بناء پر مجھے ان سے برابر دلچسپی رہی، اور ان کے قلم کی ہر چیز بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا اور لطف اٹھایا رہا۔

ان کا میلان سید صاحب سے کہیں زیادہ، مولانا ابوالکلام کی طرف تھا، کلکتہ میں ان کے مستقل قیام کے محرک اور داعی مولانا ہی تھے، اس کا احساس مجھ کو اس وقت بھی تھا۔ جب وہ سید صاحب سے ملنے دارالمصنفین آئے تھے اور سید صاحب ان کو دارالمصنفین کا ایک ایک شعبہ بڑے اخلاق کی ساتھ ان کو دکھا رہے تھے، لیکن اگر وہ پورے ندوی نہیں تو نیم ندوی ضرور تھے، پھر حدیث کی تکمیل مصر سے واپس آنے کے بعد ندوہ ہی میں مولانا امیر علی محدث ملیح آبادی سے کی تھی۔ اس لئے مولانا ابوالکلام سے غیر معمولی عقیدت و

ارادت کے باوجود ان کی زندگی کے آخر تک ان کے متعلق یہی حسن ظن تھا کہ وہ اسی طرح سید صاحب سے بھی ان کی اعلیٰ تحریری صلاحیتوں، علمی کمالات اور بلند پایہ تصنیفات کی بنا پر ویسی ہی عقیدت رکھتے ہوں گے، لیکن انہوں نے اپنی زندگی کی آخری کتاب ''ذکر آزاد'' میں جو ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے احمد سعید نے شائع کی ہے، سید صاحب اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے متعلق جو تحقیر آمیز حالات ظاہر کئے ہیں، وہ بہت ہی حیرت انگیز ہیں۔ میں نے ان کی یہ کتاب جب پڑھی تو دارالمصنفین میں سید صاحب کے ساتھ ان کی پوری تصویر میری نگاہوں کے سامنے پھر گئی اور مجھ پر ایک سکتہ طاری ہو گیا کہ کیا اس کے لکھنے والے وہی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ہیں، جن کی صلاحیتوں پر سید صاحب کو فخر تھا، اور مجھ جیسے ہیچ میرز کا یہ کہہ کر ان سے تعارف کرایا تھا، کہ یہ آپ کے ہم مسلک ہیں۔ سید صاحب ان کو دیکھ اور اپنے درمیان پا کر کتنا خوش، کتنا مسرور اور کتنا جذبہ افتخار سے بے خود تھے، آہ اسی شریف ترین سید اور بقول مولانا شبلی کے ندوہ کی کائنات کے حاصل کا اتنے رکیک اور گرے ہوئے الفاظ میں ذکر، جس کا ہم کبھی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے!

نام تو اس کتاب کا ''ذکر آزاد'' ہے، جس میں متبادر ہوتا ہے کہ یہ مولانا ابوالکلام کے سوانح وحالات اور ان کی زندگی کے مختلف النوع کارموں کے ذکر پر مشتمل ہوگی، اور اردو انگریزی میں ان پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان سب سے بہتر اور پراز معلومات ہوگی، لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی اس میں مولانا کے حالات و واقعات زندگی سرے سے پیش ہی نہیں کئے گئے ہیں، اور نہ اس مقصد کے پیش نظر وہ لکھی ہی گئی ہے، بلکہ وہ مولانا ابوالکلام اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی کے باہمی تعلقات کی داستان ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کے بہت سے غیر مطبوعہ مضامین، تحریریں اور خطوط جو انہوں نے مولوی عبدالرزاق صاحب کو لکھے تھے۔ اس میں آ گئے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ کسی قدر مفید ضرور ہو گئی ہے، لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ ذاتی تعلقات کی اس کہانی میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد

دریا بادی کے استخفاف اوران کی منقصت آخر کیا ضرورت تھی، اور پھر ان میں سے دو بزرگ تو دنیا میں موجود بھی نہیں ہیں، اوران کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو چکا ہے، البتہ مولانا عبدالماجد دریا آبادی زندہ تھے، اگر کوئی ان سے رنج پہنچا تھا، تو ان کو خط لکھ کر اس کا ازالہ کر سکتے تھے، اس سے سابق الذکر بزرگوں کی روحوں اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو تکلیف پہنچی ہو گی۔ ظاہر ہے ان میں سے کسی بزرگ کو بھی جہاں تک میرا علم ہے، مولانا ابوالکلام سے چشمک نہیں تھی، اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے تو زندگی کے آخر تک خط وکتابت اور مراسلت ومکاتبت کا سلسلہ قائم تھا، ان کے نام مولانا کے سارے خطوط، مولانا ابوالکلام پر ایک مضمون کے ضمن میں نیا دور لکھنؤ کے ایک اسپیشل نمبر میں چھپ بھی گئے، جس سے مولانا ابوالکلام کے ساتھ مولانا ے دریابادی کے اخلاص کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوالکلام کو ذہانت، قوت حافظہ، جودت طبع کے ساتھ فہم قرآن کا بہت اچھا ذوق بخشا تھا۔ الہلال اور البلاغ کی چار سال کی جلدیں اوران کی تفسیر ترجمان القرآن اس کی شاہد عدل ہیں۔ ان کے ان ہی کمالات سے مولانا عبدالماجد دریابادی کو کبھی انکار نہیں تھا۔ البتہ ان کی تصنیفی زندگی کے پہلے دور کی کتاب ''فلسفہ جذبات'' پر مولانا نے الہلال میں جو تبصرہ لکھا تھا، اُس میں ان کی حظ وکرب کی اصطلاح کی جگہ ''لذت والم'' کو ترجیح دی تھی، اس پر دونوں بزرگوں میں الہلال ہی کے صفحات میں خوب ادبی ولغوی معرکہ آرائی ہوئی تھی۔ اُس سے اُس دور کے ارباب زبان وادب نے بڑی دلچسپی لی تھی، لیکن مولانا عبدالماجد کو اپنی ہی اصطلاحات پر اصرار رہا اور وہ آخر تک لذت والم قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہُوئے لیکن ہمارے نزدیک لذت والم ہی بہتر ہے، اس بارے میں مولانا ابوالکلام حق پر تھے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ

اہل نظر کی نظر میں

میرے ایک ہشتاد سالہ استاد تھے، مولوی خدا بخش صاحب مرحوم، عربی کے فاضل، فارسی ادب کے ادا شناس، مولانا قاضی محمد مچھلی شہری کے شاگرد، مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری، صاحب تحفۃ الاحوذی شرح صحیح ترمذی (سہ جلد) جیسے مشاہیر شیوخ علم حدیث کے استاد، مولانا شبلی کے ہم عہد، شہر کے ہر طبقہ و مسلک کے لوگوں کے مرجع و معتمد علیہ، جماعت اہلحدیث کے رکن رکین اور امام، اردو فارسی کے اہل قلم، اردو ورناکیولر اسکول کی مدرسی سے ریٹائر ہو کر ایک اسلامی مکتب، مدرسہ اسلامیہ باغ میر پیٹو اعظم گڑھ کے صدر مدرس ہو گئے تھے، عربی و فارسی دونوں پڑھاتے تھے، مگر اصلاً وہ فارسی ہی کے استاد تھے، اور فارسی کا بہت اچھا اور بلند ذوق رکھتے تھے، ڈسٹرکٹ بورڈ میں اپنے لڑکے (محمد اسلم) کی ملازمت کے لئے اس کے سیکرٹری جناب سید ابو محمد صاحب ڈپٹی کلکٹر کو جو فارسی کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے، درخواست فارسی ہی میں لکھ کر دی تھی، جس سے وہ بہت متاثر ہوئے، اور جب تک وہ یہاں اس عہدے پر رہے، برابر ان کی ملاقات کے لئے مدرسہ میں آیا کرتے تھے، اور مولوی صاحب کے شاگردوں سے بھی بڑے لطف و محبت کے ساتھ پیش آتے تھے، اور ان کو اپنے بنگلہ پر بھی بلاتے تھے،

ان تمام صفات کے ساتھ مولوی صاحب زاہد شب زندہ دار، صائم الدہر اور قائم اللیل تھے، دن روزہ اور رات ذکر و عبادت میں گزرتی تھی، منہیات و محظورات سے اس قدر مجتنب اور گریزاں کہ اللہ اللہ۔۔۔!

ململ کا تکمہ دار کرتہ، جس کا گریبان ہمیشہ کھلا رہتا تھا، اور ساق تک اونچا پاجامہ، معمولی بدعت تک برداشت نہیں کرسکتے تھے، شبینہ کے تو سخت مخالف تھے، اور اس کو قرآن کے ساتھ کھلا ہوا تمسخر سمجھتے تھے، فرماتے تھے، کہ تین دن سے کم میں قرآن کے ختم کرنے کی سرے سے اجازت نہیں ہے نہ پورا قرآن ایک شب میں نماز تراویح میں صحابہ کے دور میں پڑھا گیا، قرآن کی تلاوت میں ترتیل ضروری ہے، اور شبینہ میں اس کا لحاظ بالکل اٹھ جاتا ہے، مگر نابالغ حافظ قرآن کی اقتداء میں نماز تراویح پڑھنا صحیح سمجھتے تھے، اور انہی کے فتوے پر اعظم گڑھ میں نابالغ حافظ قرآن کے پیچھے نماز تراویح کا رواج ہوا، جس پر یہاں کے حنفیہ بھی عامل ہیں۔

دنیاداری اور اس کے علائق سے کوسوں دور، دوست احباب بھی ایسے ہی دیندار اور تقویٰ شعار دن رات کا مشغلہ صرف تدریس تھا، مدرسہ میں یہ خدمت انجام دیتے تھے، گھر پر بھی پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ قائم رہتا تھا، میں سعدی کی گلستان رات ہی میں ان کے گھر جا کر پڑھتا تھا،

لیکن درس وتدریس کے شب وروز بایں مشغولیت اور بایں ورع وتقویٰ اور زہدو پارسائی، مولانا ابوالکلام کا مصور الہلال، جب ان کے پاس ڈاک سے آتا تھا، تو اس کو پاکر اتنا خوش ہوتے تھے، کہ گویا ان پر صحیفہ آسمانی نازل ہوگیا ہے۔ جب تک پورا رسالہ پڑھ نہیں لیتے تھے، کسی کو دیتے نہیں تھے، نہ کوئی اس کے دوران مطالعہ ان سے مانگنے کی ہمت کرسکتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے ایک لائق شاگرد نے جنہوں نے بعد میں مدرسہ امینیہ دہلی میں داخل ہوکر فضیلت کی ڈگری لی، اور اعظم گڑھ میں جمیعۃ علمائے ہند کی شاخ اعظم گڑھ کے بہت پرجوش ورکر ہوئے، اور ۱۹۴۲ء کی تحریک جنگ آزادی میں جیل بھی گئے اور اسی کے نتیجہ میں ان کا انتقال بھی ہوگیا، یعنی مولانا عبدالحق انہوں، مولوی صاحب سے ذرا دیر کے لئے الہلال مانگنے کی جسارت کی، تو ان کو اس زور سے ڈانٹا کہ وہ دم بخود ہوگئے، مولوی صاحب کی یاد کے ساتھ ان جیسے متورع، پرہیزگار، متقی، عالم باعمل، صاحب افتاء، عبادت گزار بزرگ کے الہلال کے ساتھ غیر معمولی شغف کی یاد بے

اعتبار تازہ ہو جاتی ہے۔

مولانا محمد علی فرماتے تھے، کہ میں نے مذہب دو آدمیوں سے سیکھا، ایک علامہ اقبال سے، دوسرے صاحب الہلال مولانا ابوالکلام آزاد سے! علامہ اقبال تو یقیناً مولانا محمد علی سے عمر میں بڑے تھے، تمام علوم و معارف اسلامیہ پر ان کی نظر تھی، ان کا علم بھی بڑا عمیق تھا، قرآن کی اس طرح تلاوت کرتے تھے، کہ یہ گویا ان ہی پر اتر رہا ہے، اور وہی اس کے مفسر، شارح اور معلم ہیں، جب وہ قرآن پڑھتے تھے، تو اس قدر روتے تھے کہ ان کے آنسوؤں سے قرآن کے اوراق تر ہو جاتے تھے، ان کی شاعری بھی الہامی تھی۔ یہ خوبی، یہ حسن، یہ اعجاز اردو فارسی کے کسی شاعر کے کلام میں نہیں ہے۔ اس لحاظ سے وہ پوری تاریخ اسلام میں منفرد ہیں، جس میں کوئی بھی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن مولانا ابوالکلام کسی قدر عمر میں ان سے چھوٹے تھے، انہوں نے جب الہلال جاری کیا، تو ان کی عمر زیادہ سے زیادہ ۲۳-۲۴ برس کی تھی، اس عمر میں اتنے پرزور اور پر اثر قرآنی مضامین جن سے مطالعے سے مولانا محمد علی جیسے ذہین، جینیئس، انگریزی کے ادیب، انشا پرداز، صحافی، جن کے اخبار کامریڈ کا، لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہند اور ان کی بیگم تک کو انتظار رہتا تھا، اور اس کو بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے تھے، اور اس کی انگریزی پر رشک کرتے تھے، اور انگریزی تہذیب و تمدن میں ہمہ وقت غرق تک کو قرآن کا دلدادہ بنا دیا، اور ان کی زندگی بدل گئی، اور آخر میں تو ان کی سج دھج اور وضع و ہیت کو دیکھ کر کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا، کہ وہ آکسفورڈ کے گریجویٹ، ریاست بڑودہ کے وزیر اعظم اور کامریڈ کے ایڈیٹر ہیں جس کے انگریزی مضامین کی لندن تک دھوم تھی، مذہب اور قرآن ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا تھا، مذہب کے بغیر لقمہ تک نہیں توڑتے تھے، اس زندگی کی تعمیر میں جہاں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صحبت اور خلافت تحریک کو بڑا دخل تھا، وہاں مولانا ابوالکلام کی معجز بیانی اور ان کے قرآنی مضامین کو بھی دخل تھا، جس کا

اعتراف ان کو زندگی بھر رہا،

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب جو قرآن کے مترجم اور مفسر تھے، اور ان کا ترجمۂ قرآن شاہ عبدالقادر کے بامحاورہ ترجمہ قرآن کی ترقی یافتہ شکل اور اردو کا بہترین ترجمہ سمجھا جاتا ہے، مولانا ابوالکلام کے فہم قرآن کے معترف تھے، ان کا الہلال بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھتے تھے، ان کے علم و فضل پر ان کو اعتماد تھا، کہ ان کی سیادت اور امامت میں کام کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے، حالانکہ دونوں بزرگوں کی عمروں میں بڑا فرق تھا، یہ الہلال کے قرآنی مضامین اور اس کے معجزانہ اسلوب نگارش کا فیض تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی جو ایک حد تک ان کے ادبی حریف، معاصر، الہلال کے معاون مدیر دارالمصنفین جیسے عالمی تصنیفی ادارہ کے بانی، مولانا شبلی کے شاگرد اور جانشین، سیرۃ نبوی کے جامع مصنف، متعدد علمی و تحقیقی کتابوں کے مؤلف اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اعزازی ڈاکٹر تھے، اور قرآن کا خود بھی بہت اچھا ذوق رکھتے تھے، اور ان کے مطالعہ بہت وسیع تھا، اپنی تمام تصنیفات میں اسی کو مبنی قرار دیا ہے، اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے نزدیک تو وہ مورخ جغرافیہ دان، متکلم، ادیب و انشاء پرداز وغیرہ سے کہیں زیادہ مفسر قرآن تھے، گو انہوں نے قرآن کی مستقل تفسیر نہیں لکھی، لیکن ان کی تاریخ ارض القرآن درحقیقت قرآن ہی کی ایک قسم کی تفسیر ہے، پھر ان کی تمام تصنیفات کا اولین ماخذ پہلے قرآن ہے، اس کے بعد حدیث، مغازی، سیر اور تاریخ ہے، انہوں نے بایں تجر قرآن اور غیر معمولی فضل و کمال کے مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کی رہائی کی تقریب میں ''نظر بندانِ اسلام'' کے عنوان سے معارف کے تین نمبروں میں ایک مضمون لکھا تھا، اس کے تیسرے نمبر میں اس دور کے نظر بندانِ اسلام میں سب سے پہلے مولانا ابوالکلام کا ذکر کیا ہے، جو رانچی میں نظر بند تھے، ان کے زمانہ قیام میں رانچی کو جو فیوض و برکات پہنچے، انہوں وہاں رہ کو جو دینی خدمات انجام دیں اور جو علمی کارنامے ان سے ظہور پذیر ہوئے، مثلاً وہاں کی جامع مسجد میں پورے ایک سال تک بعد نماز فجر درس قرآن، ترجمان

القرآن کے نام سے قرآن مجید کی ایک مؤثر تفسیر، قرآن ہی پر ''البیان'' کے نام سے ایک جامع تصنیف (۱)، فقہ اسلامی پر کتاب وسنت کی روشنی میں متعدد رسائل یعنی حقیقت الصلوٰۃ، حقیقت الصوم، حقیقت الزکوٰۃ، حقیقت الحج، حقیقت النکاح وغیرہ کی تالیف، مجددین اسلام علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ صاحب کے سوانح وحالات، منطق اور بعض دوسرے عنوانات پر کچھ تحریریں، ان سب کے ذکر سے سرشار ہوکر مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ ان سطروں کے لکھتے وقت مجھے یہ دھوکا ہورہا ہے کہ میں ابن تیمیہ، ابن القیم، شمس الائمہ سرخسی اور امیہ بن عبدالعزیز کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں، کہ یہ تمام اپنے وقت میں سجن وزنداں کی منزل سے گزرے ہیں۔ اور اپنے عقیدہ وفکر کے لئے بڑی قربانیاں پیش کی ہیں۔

خود مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، مولانا کے ادب وانشاء کی سحر کاری سے اتنا متاثر تھے، کہ فرماتے ہیں:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

(ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، ستمبر ۱۹۷۶ء)

حاشیہ:

(۱) رانچی میں نظر بندی کے زمانے کے بہت سے رسائل کے نام ملتے ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے ''باقیات ترجمان القرآن'' (جلد سوم) کے مقدمے میں ان کی فہرست مرتب کردی ہے۔ لیکن ان میں سے دستیاب ایک رسالہ بھی نہیں۔ (ا۔س۔ش)

آثار وافادات

www.KitaboSunnat.com

تذکرہ

مولانا ابوالکلام آزاد

(۱)

تذکرہ جس صورت میں پہلی مرتبہ نسخ ٹائپ میں چھپ کر منظر عام پر آیا ہے، اس کے تمام تر مرتب خود مولانا ابوالکلام آزاد ہی تھے، جیسے جیسے وہ اس کا مسودہ فضل الدین احمد صاحب کو بھیجتے جاتے تھے، وہ البلاغ پریس میں چھپواتے جاتے تھے۔ اس میں شروع ہی سے کوئی تصنیفی ربط اور نظام نہیں تھا، اور اس کا احساس خود مولانا کو بھی تھا، چنانچہ جب فضل الدین احمد صاحب نے اس نظم و ترتیب کی طرف توجہ دلائی، تو ان کو لکھا کہ "میری طبیعت میں رکاوٹ نہ پیدا کرو، جو کچھ بے اختیار قلم سے نکل جاتا ہے، بھیج دیتا ہوں، جمع کرتے جاؤ، ہر حال میں فائدہ سے خالی نہ ہوگا" اصلی مسودہ میں ربط و نظم فضل الدین احمد صاحب نہیں قائم کر سکتے تھے، اور نہ ان کو اس کی جرأت ہی ہوئی، وہ جیسے الہلال و البلاغ کے تابع و ناشر تھے، اسی طرح تذکرہ کے بھی تھے، ابوسلمان صاحب شاہ جہاں پوری نے ان کو اس کا جو مرتب بتایا ہے، وہ واقع کے بالکل خلاف ہے، زیادہ سے زیادہ آپ ان کو جامع کہہ سکتے ہیں، آج تک کسی نے یہ نہیں سمجھا کہ اس کے مرتب فضل الدین احمد صاحب ہیں اور نہ انہوں نے خود کبھی اس کا دعویٰ کیا، تذکرہ پر انہوں نے جو چند صفحہ کا دیباچہ لکھا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ماشاءاللہ ان کو پڑھنے لکھنے کا بھی سلیقہ تھا، اگرچہ اس کے علاوہ ان کی اور کوئی تحریر ہماری نظر سے نہیں گزری ہے، اپنے دیباچہ کے آخر میں

انہوں نے لکھا ہے، کہ اس تذکرہ کی دوسری جلد کے پہلے حصہ میں مولانا کے بقیہ خاندانی حالات ہوں گے۔ جو کتاب کے حجم کے بڑھ جانے کے خیال سے نکال دیے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں خود مولانا کی سوانح عمری ہوگی، جو خاکسار نے ترتیب دی ہے، لیکن چونکہ اس کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی، اس لئے اس کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی، مگر مولانا کی سوانح عمری کے جس حصہ کو وہ اپنا بتاتے ہیں، اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مولانا کے حالات زندگی کے لئے کچھ سوالات مرتب کرکے ان کی خدمت میں پیش کئے تھے، ان کا جواب مولانا نے اپنے قلم سے لکھ کر دیا تھا۔ وہی آئندہ کے لئے انہوں نے محفوظ کرلیا تھا، جس کا اعتراف خود انہوں نے اپنے اسی دیباچہ میں کیا بھی ہے۔

ان کی اس کتاب کے مرتب نہ ہونے کا ثبوت مولانا کی تحریر سے بھی ملتا ہے، مولانا نے اسی کتاب میں اعتذار کے عنوان سے لکھا ہے کہ میں اگر نظر ثانی کرتا، تو معلوم نہیں کتاب کی صورت کیا ہوتی، لیکن مرزا فضل الدین احمد صاحب نے بلا میرے علم و مشورہ کے اصل مسودہ کو چھاپنا شروع کردیا، مجھے جب اطلاع ملی، تو وہ دو ثلث سے زیادہ چھپ چکا تھا، مرزا صاحب کی تعجیل کو میں ان کے شوق و ذوق محبت پر محمول کرتا ہوں، اور اس لئے ان کا شکر گذار ہوں، چونکہ کتاب کا بڑا حصہ چھپ چکا تھا، اس لئے بقیہ اجزا کی نظر ثانی وتہذیب پر طبیعت مائل نہیں ہوئی، لوگوں نے اپنی دل جمعی وفراغ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ہیں، اپنی پریشان خاطری و پراگندگی طبع کی بھی ایک یادگار رہے تو بہتر ہے۔

گو اس میں مصنفانہ ترتیب و نظم نہ ہو، لیکن اپنے بیش بہا مباحث و مطالب اور مضامین کے اعتبار سے جن کا تعلق تذکرہ و تاریخ، کلام و عقائد، فقہ و حدیث سب سے ہے، یہ ایک بلند پایہ کتاب ضرور ہے، اس میں نظم و ترتیب یا تو خود مولانا ابوالکلام آزاد کرسکتے تھے، جس کے لئے ان کو اپنے اور اہم مشاغل علمیہ کی وجہ سے جن میں تفسیر ترجمان القرآن اور البیان وغیرہ کی تالیف بھی تھی، فرصت نہیں تھی یا انہی جیسا کوئی دوسرا دریائے علم کا ماہر شناور کرسکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی دوسرا کرتا تو اس کا انتساب اُس سے ہوتا، مولانا سے نہ ہوتا، اور پھر اس کو گوارا کرنے والے کون تیار ہوتا، یہ بہت اچھا ہوا کہ بالکل اور یجنل جیسا

کہ مولانا نے رانچی کے زمانہ نظر بندی میں بغیر کتابوں کی مراجعت کے محض اپنی قوت حافظہ کی مدد سے لکھا تھا، کمال احتیاط کے ساتھ چھپ گیا اور مولانا کے قدردانوں اور ان کے ادب وانشاء کے پرستاروں کے ہاتھوں میں پہنچ گیا اور ہر شخص نے اس صحیفۂ ادب کو حرز جان بنالیا۔ اس کا کسی کو خیال بھی نہیں آیا، کہ اس میں نظم و ترتیب ہے یا نہیں۔ اس کو مولانا کا سمجھ کر ذوق وشوق سے پڑھتے اور استفادہ کرتے رہے، یہاں تک کہ پاکستان بننے کے بعد اس کی قدردانی ہوئی، کہ وہاں کی بعض یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اردو نصاب میں شامل کرلیا گیا، اس میں گو مصنفانہ ترتیب و نظم نہ ہو، پھر بھی اس میں ایک لطف ہے، ایک لذت ہے، ایک کشش ہے، کہ جب بھی اس کو پڑھنے کے لئے اٹھایئے، بغیر ختم کئے ہوئے سیری نہیں ہوتی۔ مالک رام صاحب نے مولانا کے ساتھ غایت عقیدت کی بنا پر اس کے متن میں ہاتھ نہیں لگایا۔ اپنے گراں قدر عالمانہ محققانہ، مبصرانہ حواشی و تعلیقات و آیات واحادیث واشعار کی تخریج کے ساتھ ساہتیہ اکادیمی دہلی کی طرف سے نہایت عمدہ لیتھو میں شائع کیا، جس کے لئے وہ تمام قدردان ادب ابوالکلام کے شکریہ اور تحسین کے مستحق ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں، کہ تذکرہ کے یہ گراں مایہ اوراق مرزا فضل الدین احمد صاحب کی فرمائش سے لکھے گئے اور انہوں نے بغیر مولانا کے علم، مشورے اور استصواب کے چھاپ دیئے، اردو ادب کے شیدائیوں کو مرزا صاحب کا مشکور ہونا چاہیے، کہ ان کے ذوق وشوق سے مولانا ابوالکلام کی ایک بہترین کاوش جو ان کی حیرت انگیز قوت حافظہ کا مظہر بھی ہے، ان کی بدولت منظر عام پر آگئی، ورنہ جیسے مولانا کی اور بہت سی قلمی کاوشیں ان کی شان استغنا سے چھپنے سے رہ گئیں اور ضائع ہوگئیں۔ یہ بھی نہ چھپتی اور ضائع ہو جاتی۔ یہ علم وادب کا کتنا بڑا سانحہ ہوتا۔

اس پورے مجموعہ میں فضل الدین احمد صاحب کا کوئی دخل نہیں ہے، سوائے اس کے کہ مولانا مجمل اور حد درجہ تشنہ حالات جو انہوں نے استعارات اور تشبیہات کی زبان میں لکھے تھے، ان ہی کی فرمائش سے لکھے تھے، آئندہ کے لئے اٹھا نہیں رکھے، کتاب کے

آخر میں شامل کر دیئے، یہ بھی اردو ادب پر مرزا صاحب کا احسان ہے، دوسرے اصل کتاب کے کچھ فٹ نوٹس حجم کے بڑھ جانے کے خیال سے نکال دیئے۔ کتاب کا یہ آخری حصہ مولانا کے ادب انشا کا شاہکار ہے۔

مرزا افضل احمد صاحب اس کتاب کے محض ناشر ہی تھے، مرتب نہیں تھے، جیسا کہ ہمارے دوست ابو سلمان شاہ جہاں پوری کو غلط فہمی ہو گئی ہے، مولانا رانچی سے ڈاک سے ذریعہ اس کا مسودہ لکھ لکھ کر برابر ان کے پاس بھیجتے جاتے تھے، اور یہ ان کی ہدایت کے مطابق جمع کرتے چلے جاتے تھے۔ جب ایک متعد بہ حصہ جمع ہو گیا، تو ان کو از خود اس کے اسی حالت میں یکا یک چھاپنے کا خیال پیدا ہوا، اور مولانا کو اپنے اس خیال سے باخبر کئے بغیر شروع کر دیا، مولانا کو کسی اور ذریعہ سے اس کا علم ہوا، تو ان کو قدرتی طور پر بڑا تغض پیدا ہوا، مگر اس کتاب کا بڑا حصہ چھپ جانے کے بعد بقیہ حصہ پر نظر ثانی، اصلاح و ترمیم کو بھلا وہ کیا کرتے، ویسے ہی منتشر اور پراگندہ حالت میں بقیہ حصہ چھپ گیا، مگر کوئی کہہ نہیں سکتا، کہ مرزا افضل الدین احمد صاحب کا مخلصانہ اقدام فائدہ سے خالی رہا۔

(ہماری زبان - دہلی ۸/ مارچ ۱۹۷۰ء)

تذکرہ

مولانا ابوالکلام آزاد

(۲)

اگراللہ تعالیٰ نے تذکرہ کی ترتیب وتہذیب اور تحشیہ وتعلیق کی توفیق مجھے ارزانی فرمائی ہوتی، تو میں اس کی پرانی ترتیب کو جو مصنفانہ نہ تھی اور جس کا اعتراف صاحب تذکرہ مولانا ابوالکلام کو بھی تھا، بالکل بدل دیتا اور مولانا کے متن وحاشیہ کو ایک کر کے ازسرِنو مرتب کرنا اور شائقین کی آسانی کے لیے مضامین کے اعتبار سے اُس کی ترتیب قائم کرنا، مولانا نے اس کتاب کو اپنے دادیہال اور ننہال کے اکابر کے ذکر سے جن میں سے بعض بعض کی حیثیتیں تاریخ میں مسلم ہیں شروع کیا ہے اور جو اب تذکرہ میں آجانے سے زندہ جاوید ہوگئی ہیں۔ جن کو زمانہ مشکل ہی سے فراموش کرسکتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ بعض غیر متعلق بحث بھی آگئی ہیں، جن کا مولانا کے ان اکابر کی زندگی سے دور و قریب کا کوئی تعلق نہیں ہے، مثلاً دعوت وعزیمت کے سلسلہ میں بڑی تفصیل سے علامہ ابن تیمیہ کا ذکر آگیا ہے، کہیں ابن حزم کا ذکر ہے، کہیں خلقِ قرآن کے فتنہ کے سلسلہ میں امام احمد بن حنبل کا ذکر ہے، کہیں شاہ ولی اللہ صاحب کا ذکر ہے، کہیں مہدوی فرقہ کے بانی محمد جونپوری کا ذکر ہے، کتاب کی ایک پوری فصل اپنی مرتب کردہ سیرت قرآنیہ کے لیے وقف کردی ہے۔ اور اس سلسلہ میں مولانا شبلی کا جنہوں نے اس زمانہ میں سیرت لکھنا شروع کردیا تھا، تفصیل سے ذکر کیا ہے، جو بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے، میں مذکورہ

بالا تمام اکابر و شیوخ و ائمہ کا حال علیحدہ علیحدہ ایک ایک باب میں لکھتا، مثلاً ایک باب میں امام احمد بن حنبل کا حال، ایک باب میں علامہ ابن حزم کا حال، ایک باب میں مجددِ اسلام حافظ ابن تیمیہ کا حال، اس میں جتنا حصہ آیا ہے۔ غالباً اُن کی نا تمام سیرۃ ابن تیمیہ کا ہے، جس کو مکمل کرنے کا اُن کو موقع نہیں ملا، اگر وہ مکمل ہوگئی ہوتی تو اُردو میں اپنے ادب و انشا اور تحقیق کے لحاظ سے ابنِ تیمیہ کی بہترین سوانح عُمری ہوتی، ایک باب میں ملا محمد جونپوری کا، جنھوں نے مہدویت کا دعوٰی کیا تھا، ان پر اُردو میں بہت کم لٹریچر ہے، پھر حاشیہ میں تمام دوسرے ماخذ سے اُن کے مفصل حالات، ان کی دعوت اور دیگر تفصیلات کو لکھا جاتا؟

پھر ایک باب میں مولانا شبلی کا حال جن سے مولانا ابوالکلام کو بے حد عقیدت تھی اور ندوہ کے معاملات میں ان کا کھل کر ساتھ دیا تھا، اور ان کے بالکل ذاتی مسئلہ کو اپنے زورِ قلم سے ملک و ملت کا اہم مسئلہ بنا دیا تھا اور اس کی طرف سارے ہندوستان کی توجہ مبذول کرادی تھی اور پھر سیرت قرآنیہ والی تجویز کے سلسلہ میں ان سے جو زبانی گفتگو ہوئی تھی اور مولانا نے مواد کی کمی کے پیش نظر اس کے لکھنے سے جو پہلے معذرت کردی تھی، اور پھر ان سے مایوس ہو جانے کے بعد، جس طرح اس کو انھوں نے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا، ان سب پر تفصیل سے ذکر آتا۔

پہلے باب کو بھی فصول میں تقسیم کیا جاتا، اور الگ الگ فصول میں دادیہال و ننہال کے اکابر کا ذکر کیا جاتا، پھر آخر میں اپنے حالات میں جو چند صفحے لکھے ہیں، اُن کو رکھا جاتا، وہ اُردو ادب کا شاہکار ہے، جس پر اُردو ادب کو ہمیشہ ناز رہے گا۔

اس ذرا سی ترمیم سے اُس کی ترتیب بالکل مصنفانہ ہو جاتی اور ایک موضوع سے متعلق تمام چیزیں یکجا ہو جائیں، اور یہی کسی کتاب کا مقصد بھی ہوتا ہے، اس کتاب کو لکھنے کے دوران میں فضل الدین احمد صاحب جن کی تحریک وایما سے اپنے اسلاف کے حالات لکھنے شروع کئے تھے، اس انتشار کی طرف توجہ دلائی بھی، تو انہوں نے فرمایا کہ جس طرح میں لکھتا جاتا ہوں، اس میں رکاوٹ نہ پیدا کرو اسی طرح چلنے دو، ممکن تھا کہ نظر ثانی

میں اس کی صحیح ترتیب قائم ہو جاتی، لیکن مولانا کو آخر تک اپنے سیاسی مشاغل سے فرصت نہ مل سکی اور اپنی اس کتاب پر اپنی ساری عمر نظر ثانی کا موقع نہ مل سکا، کتاب کے مطالعہ کے وقت اس کی کمی شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے، میں اس کمی کو انہی کے لفظ و عبارت میں دور کر دیتا، جس کو کسی طرح تحریف سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا تھا، مولانا کے ذاتی حالات جس طرح آخر میں ہیں، وہ اسی طرح آخر میں رہتے۔

اس میں میرے نزدیک ہر حال میں تصنیفی ربط قائم کرنے کی ضرورت ہے اور اپنے دادیہال و نانہال کے جن اکابر کا حال انہوں نے لکھا ہے، بعض محققین کے نزدیک ان کی تاریخی حیثیت مشکوک ہو گئی ہے اس لئے تذکروں میں اگر ان کا حال ہے، تو پورے حوالہ کے ساتھ ان میں سے ہر ایک کا حال از سر نو لکھنا چاہیے، اس سلسلہ میں مولانا کا حافظہ کبھی کبھی غلطی کر جاتا ہے، میرا خیال ہے حافظہ پر کسی بھی سنجیدہ تصنیف میں زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔

غبارِ خاطر - ایک تاثر

غبار خاطر کے سارے خطوط کے مخاطب تنہا مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہیں، جن سے سارا زمانہ واقف ہے، لیکن ان خطوط کے ضمن میں اور بہت سی گمنام و سرنام شخصیتوں کا بھی ذکر آ گیا ہے، جن کو مولانا نے اپنے قلم سے زندہ جاوید کر دیا ہے، ان میں سے ایک تو میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی ہیں جو مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے معاصر اور ہم وطن تھے۔ مولانا نے انہی کے ایک مختصر رسالہ ''غبار خاطر'' سے اپنے اس مجموعہ کے لئے نام مستعار لیا ہے۔ ان کا یہ شعر بھی لکھ دیا ہے ۔

مپرس تاچہ نوشت است کلک قاصر ما
خط غبار منست ایں غبار خاطر ما

مولانا کے یہ خاص اعاجیب میں ہے کہ وہ اپنے خطوط و مضامین میں اکثر و بیشتر غیر موجودہ کتابوں اور شخصیتوں کا حوالہ دے دیا کرتے ہیں جس سے قدرتی طور پر قاری سخت الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے آزاد بلگرامی سے تو ان کی تصنیفات سرو آزاد، ید بیضا اور سبحۃ المرجان وغیرہ کی وجہ سے اہل علم اچھی طرح واقف ہیں لیکن ان کے معاصر اور مولانا کے ممدوح میر عظمت اللہ بیخبر بلگرامی سے کون باخبر ہے، اگر مولانا نے اپنی خطوط کے مجموعہ کی تقریب میں ان کا نام نہ لیا ہوتا تو اب تک لوگ ان سے بیخبر ہی رہتے۔ بہر حال ان کی شخصیت تحقیقات کا موضوع بن سکتی ہے اور ہندوستان کے فارسی تذکروں سے ان کے مفصل حالات بہم پہنچائے جا سکتے ہیں۔ اگر وہ مولوی غلام علی کے معاصر و ہم بزم تھے تو یقیناً وہ شاعر کے علاوہ اور بھی بہت کچھ رہے ہوں گے

ان کا رسالہ ''غبار خاطر'' کس فن میں تھا اس کے علاوہ اور ان کی تصنیفات کیا

کیا تھیں، اس پر مولانا نے کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے موضوع اور معانی و مطالب سے اس وقت مولانا کو کوئی سروکار نہ تھا۔ اپنے اس مجموعہ کا کوئی نہ کوئی نام رکھنا ضروری تھا، اس کے لیے بھی مستعار نام ان کو پسند آیا اور انھوں نے بے تکلف رکھ دیا۔ ان کے پہلے مجموعہ خطوط کا نام جو مدینہ پریس سے شائع ہوا تھا، کاروان خیال ہے۔ اب معلوم نہیں یہ بھی غبار خاطر کی طرح مستعار ہے یا انہوں نے خود رکھا ہے، مگر ہیں دونوں بے حد دلچسپ، دلآ ویز اور خوبصورت۔ کاروان خیال کے بھی مخاطب مولانا شروانی ہی ہیں، جن سے مولانا کو بیحد تعلق اور لگاؤ تھا، نظر سے اتنی دور اور دل سے اتنا قریب ان کے سوا اور کوئی دوسرا نہیں تھا۔

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

یہ ترانہ محبت، لطف یہ ہے کہ کاتب و مکتوب الیہ دونوں کی زبانوں پر تھا۔ مولانا کا حلقۂ احباب خواہ کتنا ہی تنگ رہا ہو، لیکن اس میں وقت کی بڑی بڑی شخصیتیں شامل تھیں، مولانا شبلی، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد سبھی سے ان کی خط و کتابت تھی، مولانا حالی کی حیات جاوید شائع ہوئی تو فوراً فرمائش کر کے اس کو منگوایا۔ اور لسان الصدق وغیرہ میں اس پر ریویو لکھا، لیکن ان میں سب سے زیادہ دل چسپی ان کو مولانا شبلی اور مولانا شروانی سے تھی، ان میں بھی مقدم شروانی ہی تھے جو قلعہ احمد نگر کی تنہائیوں میں بے اختیار یاد آئے، اور ان کو مخاطب بنا کر اتنے سارے خطوط لکھ ڈالے، جو ابوالکلامی ادب و انشا کا ایک شاہکار ہیں۔

رفقائے زنداں میں یوں تو پوری ورکنگ کمیٹی وہاں موجود تھی جس کا ایک ایک فرد ہندوستان گیر شہرت کا مالک تھا، لیکن ذکر صرف دو ہی بزرگوں کا آیا۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو کا ذوق چائے نوشی کے سلسلہ میں، جس میں وہ پنڈت جی سے کہیں آگے تھے، دوسرے ڈاکٹر محمود کے آ آ آ کی ایک ادائے خاص کا جو ان کے روزانہ کا معمول بن گئی تھی جس کو مولانا نے ایک پورے خط کے کئی مضمون میں بہت لذت لے لے کر بیان کیا

ہے، اس خط کی سرخی مولانا نے ''حکایت زاغ وبلبل'' رکھی ہے، اس میں زاغ وبلبل کے ساتھ اور بھی بہت دلچسپ جانوروں کا ذکر ہے۔ مثلاً چونٹیوں کا جن کی ضیافت کے لئے ایک طشتری میں تھوڑی سی شکر لے کر ڈاکٹر صاحب نکل جاتے اور جہاں کہیں سوراخ پاتے شکر کی ایک چٹکی اس میں ڈال دیتے۔ گوریوں کا جن کے بہت سے جوڑوں نے قلعہ احمد نگر کے کمروں میں گھونسلے بنا رکھے تھے، مرغیوں کا جن کے پالنے کا ذوق ڈاکٹر محمود کو بہت پرانا تھا، جنگلی میناؤں کا جن کا نام مولانا نے آہوان ہوائی رکھا ہے جن کی ڈاکٹر محمود بے حد ضیافت کرتے تھے، روز صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لیکر نکل جاتے اور صحن میں جا کھڑے ہوتے، پھر جہاں تک حلق کام کرتا آ آ کرتے جاتے اور ٹکڑے دکھا دکھا کر فضا میں پھینکتے رہتے۔ لیکن یہ صلائے عام میناؤں کو ان کی طرف ذرہ بھی ملتفت نہ کرتی پھر کووں کا جن کو مولانا نے شہرستان ہوا کے دریوزہ گران ہرجائی سے تعبیر کیا ہے۔ ڈاکٹر محمود کا دام ضیافت جو وہ میناؤں کے لئے بچھاتے تھے، اس کو یہی دریوزہ گران کوتہ آستین اپنی دراز دستیوں سے صاف کر کے رکھ دیتے گلہریوں کا جن کے جھنڈ کے جھنڈ صحن جیل میں کودتے پھرتے اور وہ ڈاکٹر محمود کی صلائے عام پر فوراً لبیک کہتیں اور ''مرحمت عالی زیادا'' کہتے ہوئے اس دسترخوان کرم پر ٹوٹ پڑتیں، کووں کی دراز دستیوں سے جو بچتا وہ ان کوتاہ دستوں کی کام جوئیوں کا کھاجا بن جاتا۔ وہ اس طرح سے سر ہلا ہلا کر روٹی کے ٹکڑے چباتیں کہ معلوم ہوتا کہ ڈاکٹر محمود کو داد ضیافت دے رہی ہیں۔ پھر گدھوں کا جو ناخواندہ مہمانوں کی طرح جیل میں نازل ہو گئے تھے۔ جن کا کہیں آنا بزرگوں کے نزدیک منحوس سمجھا جاتا ہے، لیکن مولانا نے لکھا ہے کہ ان حضرات کے بارے میں بزرگان سلف کا کچھ ہی خیال رہا ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی تشریف آوری ہمارے لئے بڑی ہی بابرکت ثابت ہوئی کیونکہ ادھر ان کا مبارک قدم آیا ادھر محمود صاحب نے ہمیشہ کے لئے اپنا سفرہ کرم لپیٹنا شروع کر دیا۔

شیخ جی آپ کے آتے ہی ہوا دیر خراب
قصد کعبے کا نہ کیجئے گا بہ ایں یمنِ قدوم

جواہر لال جی کا بھی ایک تقریب کے سلسلہ میں اس خط میں ذکر آگیا ہے، جب

یہ فخر ہندوستان زندانی اس جیل میں داخل ہوئے تھے تو صحن بالکل چٹیل میدان تھا، بارش نے سبزہ پیدا کرنے کی بار بار کوششیں کیں، لیکن وہاں کی مٹی نے ان کوششوں کا بہت کم ساتھ دیا، اس بے رنگ منظر سے سارے زندانیوں کی آنکھیں اکتا گئی تھیں اور سبزۂ وگل کے لئے ترسنے لگی تھیں، ان لوگوں نے سوچا کہ باغبانی کا مشغلہ کیوں نہ اختیار کیا جائے کچھ اور نہ سہی تو یہی سہی کہ یہ اصحاب صورت اور اصحاب معنی دونوں کیلئے سامان ذوق بہم پہنچاتا ہے۔

بہ بو اصحاب معنی را بہ رنگ اصحاب صورت را

جواہر لال جن کا جوہر مستعدی ہمیشہ ایسی تعمیری تجویزوں کی راہ دیکھتا رہتا ہے فوراً کمربست ہو گئے اور فوراً اس خرابے میں رنگ وبو کی تعمیر کا سروسامان شروع ہو گیا۔

آبپاشی کا مرحلہ پیش آیا تو زندانیوں کے اس قافلے کے ایک صاحب نے جو بنگالی تھے اور بڑی سائنٹفک معلومات رکھتے تھے، یہ مشورہ دیا کہ اگر پھولوں کے پودوں کو حیوانی خون سے سینچا جائے تو ان میں بالیدگی اور نشوونما کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے اور ہفتوں کی راہ دنوں میں طے ہو جاتی ہے لیکن اس زمانہ میں جب کہ جنگ کی وجہ سے آدمیوں کو خون کی ضرورت پیش آ گئی تھی اور اس کے بنک کھل رہے تھے، بھلا درختوں اور پودوں کے لئے کون اپنا خون دینے کی لئے تیار ہوتا ایک صاحب نے کہا کہ یہاں قلعہ کے فوجی مشن میں روز مرغیاں ذبح کی جاتی ہیں انہیں کا خون لے کر کیوں نہ جڑوں میں ڈال دیا جائے اس مشورہ پر مولانا کا جذبۂ شعری دفعتہً بیدار ہو گیا اور ارتجالاً ایک شعر سوجھ گیا۔

کلیوں میں اہتزاز ہے پرواز حسن کی
سینچا تھا کس نے باغ کو مرغی کے خون سے

اگر مرغی کی جگہ بلبل کر دیا جائے تو خیال بندوں کی طرز کا اچھا خاصہ شعر ہو جائے گا۔

غنچوں میں اہتزاز ہے پرواز حسن کی
سینچا تھا کس نے باغ کو بلبل کے خون سے

ان زندانیوں میں آصف علی بھی تھے، یہ شعر سن کر ان کے بھی شاعرانہ ولولے

جاگ اٹھے اور اسی زمین میں غزل کہنی شروع کر دی، لیکن قافیہ کی تنگی سے غزل مکمل نہ ہو سکی۔

بہرحال دسمبر شروع ہوتے ہی سارے میدان کی صورت بدل گئی۔ اور اس کے بعد جنوری آئی تو صحن کا ہر گوشہ مالن کی جھولی اور ہر تختہ دستِ گل فروش بن گیا۔

پھولوں کے سارے درخت موسمی تھے، جس کی قسمیں چالیس سے بھی مستزاد ہو گئی تھیں، جنھوں نے اس خرابہ بے رنگ و بو کو اپنی گل شگفتگیوں سے رنگین کر دیا تھا، جب صبح کے وقت آسمان پر سورج کی کرنیں مسکرانے لگتیں تو زمین پر ''مارننگ گلوری'' کی کلیاں کھل کھلا کر ہنسنا شروع کر دیتیں۔

شیرینی تبسم ہر غنچہ رامپرس
درشیر صبح خندۂ کلہا شکر گزاشت

''مارننگ گلوری'' ایک قسم کا پھول تھا۔ مولانا نے پہلے اس کا ترجمہ ''اجلال صبح'' کیا۔ لیکن یہ کچھ بنا نہیں بلکہ ذوق سلیم پر بار بھی ہو گیا، تو اس کو پھر انہوں نے ''بہار صبح'' کے نام سے پکارا، بعد میں اسی نام کے ساتھ کچھ اور تفصیلات لکھی ہیں جو دلچسپ ہیں

غرض ایک ایک کر کے مولانا نے تمام پھولوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی خصوصیات بھی لکھی ہیں، ان میں مشرقی سے کہیں زیادہ مغربی پھول تھے جن کے جلوہ فروشیاں ہر دم دیدۂ و دل کو دعوت نظارہ دیتی رہتی تھیں۔

صحن جیل کی چمن بندی و چمن آرائی کا ذکر بہت دور تک چلا گیا ہے جو صرف پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور مولانا نے اس میں خوب خوب گل فشانیاں کی ہیں۔ آگے چل کر مولانا نے بلبل کا ذکر بھی چھیڑ دیا ہے جس کا ایک جوڑا انہی کی نظر کے سامنے مخطمی کے شگفتہ پھولوں کے ہجوم میں آ کر بیٹھ گیا تھا اور گردن اٹھائے نغمہ سنجی کر رہا تھا۔ مولانا کو بے اختیار حافظ شیرازی کی یہ غزل یاد آ گئی۔

صفیر مرغ برآمد بط شراب کجاست
فغاں فتادز بلبل نقاب گل کے درید

مولانا نے ان کی خوش نوائیوں سے بڑا لطف لیا، بلبل کی نواؤں کا ذوق حقیقت میں ایران کے حصہ میں آیا ہے اور وہیں کے لوگ ان سے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں، ہندوستان میں ان کی قدر نہیں۔ ان کی جگہ یہاں طوطوں اور میناؤں نے لے لی ہے اور انہیں کی خوش نوائیوں سے یہاں کے لوگ محظوظ ہوتے ہیں۔ حافظ کا شعر ہے۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

ان کے علاوہ یہاں کوئل کی صدائیں بھی شاعری کے کام آتی ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ اس کی کوک درد آشنا دلوں کو غم والم کی چیخوں سے کم محسوس نہیں ہوتی۔

مولانا نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں عام طور پر چار قسم کی بلبلیں پائی جاتی ہیں جن میں سے شاما بھی ہے گو اس کو عام طور پر بلبل تو نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن اسے میدانی سر زمینوں کا بلبل ہی تصور کرنا چاہیے۔

قلعہ احمد نگر جیل میں ایک چھوڑ تین تین جوڑے آتے رہے، ان میں سے ایک نے تو پھول کی ایک بیل میں اپنا آشیانہ بھی بنا لیا تھا اور اس طرح سے وہ مولانا کا ہم سفر بھی ہو گیا، جس کی ترانہ سنجیوں اور نغمہ آفرینیوں سے مولانا کا خلوت کدۂ سکون فردوس گوش بن گیا تھا۔

اس کتاب میں ایک صاحب چیتہ خاں کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ آیا ہے، جس پر بہت کم لوگوں کی نظر پڑی ہو گی۔ یہ حضرت در حقیقت انگریز تھے اور قلعہ احمد نگر کے عارضی جیل کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہو کر آئے تھے۔ جن کا نام ایم سینڈک تھا۔ مولانا کو یہ نام بہت ناموس معلوم ہوا۔ انہوں نے اس کا نام ایک خاص مناسبت سے چیتہ خاں رکھ دیا۔ اور وہی زبانوں پر چڑھ گیا۔ اور جب تک وہاں ان معزز محترم زندانیوں کا قیام رہا وہ اسی ہندوستانی نام سے پکارا جاتا رہا۔ یہ مولانا کا بے حد مخلص اور قدر دان تھا۔ اور ان کی یہ فرمائش خواہ وہ کتنی ہی عسیر الحصول ہو، پوری کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ مولانا بھی اس کی خدمات کے بڑے معترف تھے۔ اور اس سے ان کو بڑی دلچسپی ہو گئی تھی۔ تھا تو وہ اس جیل

کے افسر اعلیٰ، لیکن ان بزرگوں کا ہر کام ایک معمولی نوکر کی حیثیت سے کرتا تھا اور اس پر خوش ہوتا تھا۔ انشاء اللہ کبھی اس کا مفصل ذکر ہم ایک مستقل مضمون میں کریں گے۔ اس شخص کی وقعت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس حکمران قوم سے تعلق رکھتا ہے جس کے نزدیک یہ زندانیان عالی مرتبت ملک کے باغی اور انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ اور انگریزوں کو نکال کو اپنی حکومت قائم کرنے کا داعیہ رکھتے تھے، اور یقیناً اس کو ان کی اس حیثیت کا ضرور خیال رہا ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے لئے ہمہ تن خلق و محبت بن گیا تھا۔

مولانا نے ایک خط میں ایک قدیم فرنچ مصنف کا ذکر تفصیل سے کیا ہے، یہ پانچویں صلیبی حملہ کے زمانہ کا ایک مجاہد ہے۔ اور شاہ فرانس سینٹ لوئس نے مصر پر جب پانچواں صلیبی حملہ کیا تھا تو اس میں یہ شریک تھا۔ اس کا نام ''ژے آن دوژواین ویل'' ہے، جس سے شاید ہی ہندوستان کے اہل علم واقف ہوں، اس نے اپنی عمر کے آخری سالوں میں ایک کتاب لکھی تھی۔ جو درحقیقت اس جنگ سے متعلق اس کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ مولانا نے کبھی اس کو پڑھا تھا۔ ان کے ایک رفیق زنداں نے ایوری مینس لائبریری کی کچھ کتابیں جیل ہی میں پڑھنے کے لئے منگوائیں، انہیں میں یہ بھی آ گئی، مولانا نے بھی اس کو پڑھ ڈالا۔ اور اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ ایک پورا مکتوب اپنے تاثرات کی نذر کر دیا۔ اس سلسلے میں دو واقعے خاص طور سے لکھے ہیں۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ قیام مکہ کے زمانہ میں لوئس شاہ فرانس نے سلطان دمشق کے پاس ایک سفیر بھیجا تھا۔ جس کے ساتھ بطور مترجم کے ایک شخص اور بھی تھا جس کا نام ایوے لا بریتان تھا۔ یہ شخص مسیحی واعظوں کے طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اور مسلمانوں کی زبان سے واقف تھا۔ مولانا نے مسلمانوں سے متعلق اس کے تاثرات بھی اس فرنچ مصنف کے حوالہ سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیے ہیں۔

یہ غبار خاطر کا خشک ترین حصہ ہے جس سے عام ناظرین کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی، لیکن اس سے مولانا کی فرنچ زبان سے واقفیت اور ان کے گہرے مطالعہ کا اندازہ

ضرور ہوتا ہے۔ مولانا کے وسیع تعارف کے بعد ضرورت ہے کہ ندوۃ المصنفین، یا انجمن ترقی اردو یا کوئی دوسرا ادارہ اس کو اردو میں بھی منتقل کر دے۔ صلیبی جہاد کی تاریخ سے یوں تو اردو کا دامن خالی نہیں ہے، بہت سی کتابیں لکھی اور ترجمہ کی گئی ہیں۔ لیکن اگر اس کا بھی ترجمہ ہو گیا تو صلیبی جہاد کی تاریخ کے ذخیرۂ کتب میں ایک مستند ترین کتاب کا اضافہ ضرور ہو جائے گا۔

مولانا نے اپنے مکتوب میں جو کلکتہ سے بمبئی کی روانگی کے وقت حالت سفر میں ۳-اگست ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا جو اٹیچی کیس میں پڑا رہ گیا اور مکتوب الیہ تک نہ پہنچ سکا۔ اپنے ملازم خاص عبداللہ کا بھی ذکر کیا ہے جو ان کا ہمہ وقتی خادم اور ان کا بڑا مزاج دان تھا۔ اور سفر و حضر میں برابر ان کے ساتھ رہتا تھا۔ مولانا کے لئے زیادہ تر چائے وہی بناتا تھا جس کو مولانا بڑے ذوق شوق سے پیتے تھے۔ اس میں عبداللہ سے بعض وقت کوتاہی بھی ہو جاتی تھی، اور مولانا کو خود اپنے ہاتھ سے چائے بنانی پڑتی تھی، اس سفر میں بھی وہ ساتھ تھا اور یہی خدمت انجام دیتا تھا۔ وہ ٹھیک وقت پر یعنی صبح کے تین اور چار بجے کے درمیان نمودار ہوتا اور اپنی خدمت پر لگ جاتا، نہ آتا، تو خود مولانا ہی کو اپنے دست شوق کی کا مجویانہ سرگرمیاں کام میں لانی پڑتیں، اس کے بعد وہ ہمہ تن معذرت بن کر سامنے کھڑا ہوا جاتا اور مولانا کو اس وقت کچھ کہتے بن نہ پڑتا۔ مولانا نے لکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نسیم صبح گاہی کا ایک ہی عمل دو مختلف طبیعتوں کے لئے دو متضاد نتیجوں کا باعث ہو جاتا ہے، اس کی آمد مجھے بیدار کر دیتی ہے، عبداللہ کو اور زیادہ سلا دیتی ہے، اور اپنے فرض سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔

باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست

درباغ لالہ روید ودر شور بوم خس

مولانا ابھی سفر ہی میں تھے کہ تین بجے کا وقت پھر آ گیا۔ عبداللہ نسیم صبح گاہی کی تھپکیوں میں میٹھی نیند سو رہا تھا مولانا کا دست شوق بڑھا، دیا سلائی اٹھائی اور چولہا روشن کر دیا، اب چائے پی رہے ہیں اور مولانا شروانی کی یاد تازہ کر رہے ہیں اور خط لکھ رہے ہیں

نفسے بیاد تو می زنم چہ عبارت و چہ معانیم

مولانا بمبئی میں بھولا بھائی ڈیسائی کے مہمان ہوا کرتے تھے، جن کے مولانا بڑے قدردان، اور ان کی دستوری اور پارلیمنٹری قابلیت کے بڑے معترف تھے۔ یہ مرکزی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر اور کانگریس ورکنگ کمیٹی کے بہت زمانے تک ممبر تھے، گاندھی جی کی رہائی کے بعد ۱۹۴۴ء میں بعض لوگوں کو خیال پیدا ہوا کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ کے بجائے مرکزی اسمبلی کی کانگریس پارٹی اور مسلم لیگ پارٹی میں کوئی مفاہمت ہو جائے تو سیاسی تعطل دور ہو سکتا ہے، چنانچہ بعض مشترک دوستوں کے ذریعہ بھولا بھائی ڈیسائی اور لیاقت علی خان میں ملاقات کرائی گئی، جس کی حوصلہ افزائی گاندھی جی نے بھی کی۔ لیکن بدقسمتی سے کوئی مفاہمت نہ ہو سکی، بھولا بھائی ڈیسائی کا یہ اقدام ان کی آئندہ سیاسی زندگی کے لئے مصیبت بن گیا۔ اور ولبھ بھائی پٹیل کو ان سے شدید بدگمانی ہو گئی جس سے آخر میں گاندھی جی بھی متاثر ہو گئے۔ اور روز بہ روز گاندھی جی ان سے بدگمان اور برہم ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ کانگرس کے اس سب سے بڑے پارلیمنٹری لیڈر کو ۱۹۴۵ء کے عام انتخابات میں کانگرس کا ٹکٹ تک نہیں دیا گیا۔ جس کا ان کی صحت پر بہت برا اثر پڑا اور خانہ نشین ہو گئے۔ مولانا ابوالکلام ان کو بالکل بے قصور سمجھتے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کی شرکت کے لئے بمبئی آئے تو انہیں کے یہاں ٹھہرے، وہ اس وقت کے حالات سے بہت پریشان تھے، بلکہ بعض قرائن سے ان کو کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ یہ لوگ گرفتار ہو جائیں گے۔ مولانا سے انہوں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا تو مولانا نے کوئی توجہ نہیں کی۔ کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ ہوا، اور ان کی گرفتاری کی خبریں گرم ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ لیکن مولانا نے پورے اطمینان کے ساتھ رات گزاری۔ حسب معمول چار بجے اٹھے، لیکن طبیعت بالکل تھکی ہوئی اور سر میں سخت درد تھا۔ چائے پی اور قلم اٹھایا اور بعض ضروری خطوں کا مسودہ لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ جو پریسیڈنٹ روز ویلٹ وغیرہ کو بھیجے جانے والے تھے۔ اسی درمیان میں مولانا پر غنودگی طاری ہو گئی اور وہ لیٹ گئے، دس بارہ منٹ گزرے ہوں گے کہ انہی

بھولا بھائی ڈیسائی کے صاحبزادے نے مولانا کا پیر دبایا، مولانا بیدار ہوئے تو دیکھا کہ دھیرو ایک کاغذ ہاتھ میں لئے کھڑا ہے۔ مولانا نے پوچھا کیا ہے، کہا کہ دو فوجی آفیسر ڈپٹی کمشنر پولیس کے ساتھ آئے ہیں اور یہ کاغذ لائے ہیں۔ مولانا صورت حال سمجھ گئے۔ اور دھیرو سے کہا کہ جاؤ ان لوگوں سے کہ دو کہ مجھے تیار ہونے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا، وہ میرا انتظار کریں۔ مولانا نے غسل کیا، کپڑے پہنے، چند ضروری خطوط لکھے اور باہر نکل کر سرکاری کار میں بیٹھ گئے، مولانا نے اس وقت کا نقشہ اس طرح اپنے الفاظ میں کھینچا ہے۔

کار باہر نکلی تو صبح مسکرا رہی تھی، سامنے دیکھا تو سمندر اچھل اچھل کر ناچ رہا تھا، نسیم صبح کے جھونکے احاطے کی روشوں میں پھرتے ہوئے ملے، یہ پھولوں کی خوشبو چن چن کر جمع کر رہے تھے اور سمندر کو بھیج رہے تھے کہ اپنی ٹھوکروں سے فضا میں پھیلاتا پھرے، ایک جھونکا کار میں سے گزرا تو بے اختیار حافظ کی غزل یاد آ گئی۔

صبا وقت سحر بوئے ززلف یارمی آورد
دل شوریدۂ ما راز تو ، درکارمی آوارد

غبارِ خاطر
و
کاروانِ خیال

ایک بڑی چیز مولانا کے ذاتی اور نج کے خطوط اور مکاتیب ہیں، جو ان کی زندگی کے آخر تک معلوم نہیں، کتنی تعداد میں لکھے گئے ہوں گے، ان کے اکٹھے کرنے کی طرف کسی نے اب تک توجہ نہیں کی ہے، مکاتیب کے دو مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں، ایک تو مدینہ پریس نے شائع کیا ہے، جس کا نام کاروان خیال ہے،'' دوسرا غبار خاطر ہے، جو قلعہ احمد نگر جیل کی ایک علمی و ادبی یادگار ہے، ان دونوں مجموعوں کے خطوط کے مخاطب ایک ہی بزرگ ہیں، یعنی مولانا کے حبیب صادق مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم صدر دارالمصنفین اعظم گڈھ، جو خود بھی وقت کے صاحب طرز انشا پرداز، فارسی و اردو کے شاعر اور مصنف تھے، کاروان خیال کے خطوط زیادہ تر کلکتہ سے لکھے گئے ہیں، جو مولانا کا مستقر اور ان کی ملی و دینی اور قومی و سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا، تین خط وایسرایگل لاج شملہ سے لکھے ہیں، جہاں مولانا بانکوڑا جیل سے رہا ہونے کے بعد شملہ کانفرنس میں شرکت کے لیے تشریف لے گئے تھے، ایک خط میں جو ۲۷ جون ۱۹۴۵ء کو لکھا ہے، خطاب کے بعد صرف یہ شعر ہے:

اے غائب ازنظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می بینمت عیاں و دُعا می فرستمت

دوسرا خط ۶ رجولائی ۱۹۴۵ء کا ہے، چند جملوں پر مشتمل ہے، بیچ میں یہ شعر ہے:

گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود درسفر روحانی

تیسرا خط ۹ رجولائی کا ہے، جو مولانا کی اہلیہ کی وفات پر مولانا شروانی کے تعزیت کے خط کے جواب میں ہے، لکھتے ہیں:

''صدیق مکرم! نامۂ تعزیت کے لیے شکر گذار ہوں، ایک زخم ہوتو اس کا مرہم ڈھونڈوں، اب تو دل سرتا سرزخم ہو چکا:

پیش ازیں صد داغ بردل داشتم اکنوں یکے است''

دو خط مولانا نے سری نگر کشمیر سے لکھے ہیں، جہاں وہ گم شدہ صحت کی جستجو کے لئے تشریف لے گئے تھے، ایک خط میں فیضی کا یہ شعر لکھا ہے:

ہزار قافلہ شوق می کند شب گیر
کہ بارعیش کشاید بخطۂ کشمیر

لیکن ان کو یہاں کوئی فائدہ نہیں ہوا، لکھتے ہیں ناخوشی و علالت کا بوجھ سر پر اٹھائے ہوئے آیا تھا اور سر پر اٹھائے واپس جاؤں گا، یہ کشمیر کی جاں پرور آب و ہوا کا قصور نہیں ہے، میرے جسم ناساز کا قصور ہے:

ہر چہ ہست از قامت ناساز و بے اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس دشوار نیست

تیسرا خط ۴ رستمبر ۱۹۴۵ء کا ہے، لکھتے ہیں:

''وہی صبح چار بجے کا جاں فزا وقت ہے، ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں، دہنی طرف جھیل کی وسعت، شالامار اور نشاط باغ تک پھیلی ہوئی ہے، بائیں طرف نسیم باغ کے چنار کے درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں، چائے پی رہاہون اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں

گرچہ دوریم بہ یاد تو قدح می نوشیم
بعد منزل نہ بود در سفر روحانی!

ایک خط مسوری سے یکم جون ۱۹۴۶ء کو لکھا ہے، جو مولانا شیروانی کی چینی چائے کی فرمائش کے جواب میں ہے، جس کا دونوں بزرگوں کو یکساں ذوق تھا۔

دوائے دردِ دل خود ازاں مفرح جوئے
کہ در صراحی چینی و شیشہ حلبی ست

مگر وہ مولانا کے یہاں ختم ہو چکی تھی، ایک دوسری چائے تھوڑی سی باقی تھی، اسی کا ایک حصہ ارسال خدمت کر دیا،

زاہد از ماخوشہ تاکے بہ چشم کم مبیں
ایں نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ایم

ایک خط دہلی سے یکم نومبر ۱۹۴۶ء کو لکھا ہے، جہاں وہائٹ جیسمین یعنی چین کی بہترین چائے کا ایک ڈبہ آ گیا تھا، اس میں سے تھوڑی مولانا نے خود رکھ لی اور باقی روانہ خدمت کر دی۔

مے خور بہ شعر بندہ کہ دل تنگیست مباد
بعد از تو خاک برسر اسباب دنیوی

اس میں مولانا کے تمام خطوط کے جواب میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے بھی تمام خطوط نقل کر دیے گئے ہیں، شروع میں اس مجموعہ پر شاہد خان شروانی کے قلم سے ایک طویل مقدمہ ہے جو ۷۵ صفحہ تک چلا گیا ہے۔

غبار خاطر کے تو سارے مکاتیب قلعہ احمد نگر جیل کی تنہائیوں میں عالم خیال میں مولانا شروانی کو خطاب کر کے لکھے گئے ہیں اور وہ مولانا کی رہائی بلکہ کتابی صورت میں چھپنے کے بعد مکتوب الیہ کو موصول ہوئے ہیں، ان میں وہی سادگی، بے ساختگی اور برجستگی ہے، جو بے تکلف لکھے ہوئے خطوں میں ہو سکتی ہے لیکن وہ خطوط سے زیادہ مضامین ہیں۔ جو ادب، تاریخ، فلسفہ اور علم موسیقی سے تعلیق رکھتے ہیں اور جو مولانا کے علم، ذہانت، قوتِ حافظہ اور غیر معمولی یادداشت کے مظہر ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا جیل کی تنہائیوں میں نہیں، جہاں کتاب تو کتاب کاغذ و قلم تک مشکل سے میسر آتا ہے، بلکہ کسی کتب خانہ میں مہ جبینانِ علمی کے جھرمٹ میں لکھ رہے ہیں اور ہر ہر کتاب کا حوالہ دیتے چلے جاتے ہیں ایک خط تو شروع سے آخر تک شہر احمد نگر اور اس کے قلعہ کے تاریخ پر ہے، جس میں وہ

عارضی طور پر چند سال کے لئے محبوس تھے، اور اس کو پڑھ کر حیرت ہوئی ہے کہ سارے معلومات، سارے جزئیات کے ساتھ گوناگوں زندگی کے ترددات و افکار و آلام کے باوجود جن میں ایک مولانا کی اہلیہ کی شدید ترین علالت بھی تھی۔ جس کی خبریں پورے تسلسل کے ساتھ جیل تک پہنچ رہی تھیں، اور مولانا رہ رہ کر بے چین ہو جاتے تھے، مولانا کے نہاں خانہ دماغ میں کیسی محفوظ رہ گئے یہ ادب و انشا کا گلدستہ بھی ہے اور تاریخ و فلسفہ کی خشک کتاب بھی، جیل کی دلچسپیوں کی روداد بھی ہے اور ارباب زنداں کے ساتھ چائے کی شادکامیوں اور سرمستیوں کی دل پسند حکایت بھی، جس کے بار بار پڑھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی۔ اور ہر مرتبہ اس کے پڑھنے میں نئی لذت محسوس ہوتی ہے، ضرورت ہے کہ مولانا کے نج خطوط بھی جو انہوں نے دوسرے بزرگوں، دوستوں اور نیازمندوں کو لکھے ہیں اکٹھا کر کے شائع کیا جائے۔ وما ذالك على الله بعزيز

غبار خاطر کی بعض غیر معروف شخصیتیں

مولانا کے مجموعہ ''خطوط غبار خاطر'' میں ضمناً بہت سے لوگوں کے نام آئے ہیں۔ اُن میں زمانہ حال کے مشاہیر کے نام بھی ہیں اور غیر معروف اور قابل الذکر لوگوں کے بھی ان میں سے اکثر وہ ہیں جو مولانا کی قومی وسیاسی و پبلک زندگی سے نہیں پرائیویٹ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں، اور جن کا تعلق صرف مولانا کی ذات سے تھا اور کسی سے نہ تھا، چونکہ ان کے حالات سے بھی مولانا کی زندگی سے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ اِس لئے اُن کے حالات غبار خاطر کی روشنی میں ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ جو انشاء اللہ خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

حافظ ولی اللہ:

ان میں سے ایک حافظ ولی اللہ صاحب ہیں، جو بچپن میں مولانا کے اتالیق اور نگراں تھے۔ مولانا سیر وتفریح کے لیے باہر نکلتے تو یہ بھی ساتھ ہوتے۔ اِس حالت میں بھی مولانا اپنے ساتھ کتاب لے جاتے اور جہاں موقع پاتے مطالعہ میں مصروف ہو جاتے۔ ایک مرتبہ یہ حافظ صاحب کے ساتھ سیر کو نکلے۔ کتاب حسب معمول ہاتھ میں تھی ڈلہوزی اسکوائر میں پہنچے تو درختوں کے ایک جھنڈ کے اندر جا کر مطالعہ میں غرق ہو گئے۔ حافظ صاحب ان کے انتظار میں باہر ٹہلتے رہے۔ بہت زیادہ دیر ہو گئی تو جھنجھلا کر مولانا

سے کہا کہ اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی، تو گھر سے نکلا کیوں؟ اُن کی یہ سرزنش اور تہدید ہر سیر و تفریح میں قائم رہی۔ مولانا نے لکھا ہے کہ "حافظ صاحب مرحوم کی آواز آج تک کانوں میں گونج رہی ہے"۔

عبداللہ:

دوسرا ان کا ہمہ وقتی خادم عبداللہ ہے، جو مولانا کا بہت زیادہ قابل اعتماد خادم تھا اور سفر و حضر میں برابر ساتھ رہتا تھا اور ان کے اعلیٰ مذاق کے مطابق چائے بناتا اور پلاتا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں کلکتہ سے بمبئی کے تاریخی سفر میں بھی ساتھ تھا۔ مولانا نے اُس خط میں جو دوران سفر میں ۳ راگست ۱۹۴۲ء میں کلکتہ سے بمبئی کے تاریخی سفر میں بھی ساتھ تھا۔ مولانا نے اُس خط میں جو دوران سفر میں ۳ راگست ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا اور جو اٹیچی کیس میں پڑا رہ گیا، اور مکتوب الیہ تک نہ پہنچ سکا۔ لکھتے ہیں:

تین بجکر چند منٹ گزرے تھے کہ آنکھ کھل گئی۔ صبح کی چائے کے لیے سفر میں یہ معمول رہتا ہے کہ رات کو عبداللہ اسپرٹ کا چولہا اور پانی کی کیتلی، پانی بمقدار مطلوب بھری ہوئی، ٹیبل پر رکھ دیتا ہے، چائے دانی اُس کے پہلو میں جگہ پاتی ہے کہ بحکم "وضع الشئ فی محلہ" یہی اُس کا محل صحیح ہونا چاہیئے اگر صبح تین بجے سے چار بجے کے اندر کوئی اسٹیشن آجاتا ہے، تو اکثر حالتوں میں عبداللہ آکر چائے دم دے دیتا ہے، نہیں آیا تو پھر خود مجھے ہی اپنے دستِ شوق کی کام جویانہ سرگرمیاں کام میں لانی پڑتی ہیں۔ بعض حالتوں میں گاڑی اسٹیشن میں رک بھی جاتی ہے مگر عبداللہ کی صورت نظر نہیں آتی، پھر جب نظر آتی ہے تو اس کی معذرتیں میری فکر کاوش آشنا کے لیے ایک دوسرا ہی مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ نسیم صبح گاہی کا ایک ہی عمل دو مختلف طبیعتوں کے لیے دو متضاد نتیجوں کا باعث ہو جاتا ہے، اس کی آمد مجھے بیدار کر دیتی ہے، عبداللہ کو اور زیادہ سلا دیتی ہے۔ الارم کی ٹائم پیس بھی اس کے سرھانے رہنے لگی ہے، پھر بھی نتائج کا اوسط تقریباً یکساں ہی رہا۔ معلوم نہیں آپ اس اشکال کا حل کیا تجویز کریں گے، مگر مجھے شیخ شیراز کا بتلایا ہوا حل مل گیا ہے اور اس میں مطمئن ہو چکا ہوں۔

باراں کہ درلطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید ودر شور بوم خس

بہر حال چائے کا سامان حسب معمول مرتب اور آمادہ تھا۔نہیں معلوم آج اسٹیشن کب آئے اور آئے بھی تو اس کا اطمینان کیوں کر ہو کہ عبداللہ کی آمد کا قاعدہ کلیہ آج ہی بہ حالت استثنا نمودار نہ ہوگا۔میں نے دیا سلائی اٹھائی اور چولہا روشن کردیا اب چائے پی رہا ہوں،اور آپ کی یاد تازہ کررہا ہوں۔

نفسے بیادتومی زنم چہ عبارت وچہ معانیم

دھیرو:

تیسرے دھیرو ہیں جو مرکزی اسمبلی دلی کی کانگریس کے مشہور روزگار لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی کے صاحبزادے ہیں۔بمبئی کے اس سفر میں مولانا انہیں کے یہاں مقیم تھے، یہ باپ بیٹے اس وقت کی صورت حال سے بے حد پریشان تھے اور ان کو کسی طرح اس کی سن گن لگ چکی تھی کہ مولانا گرفتار ہوجائیں گے لیکن مولانا کو خود کوئی پریشانی نہیں تھی اور ہرصورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے،وہ ان باپ بیٹے کی پریشانیوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے اور پوری دلجمعی واطمینان قلب کے ساتھ اپنے تمام ضروری کاموں اور پروگراموں کی تکمیل میں لگے رہے۔یہاں تک کے وہ خطرہ پیش آ گیا،اور بمبی کا ڈپٹی کمشنر گرفتاری کا وارنٹ لے کر بھولا بھائی ڈیسائی کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔دھیرو نے مولانا کو اطلاع دی تو فرمایا اس سے کہہ دو کہ مجھے ابھی تیار ہونے میں دیر ہے،وہ میرا انتظار کرے،گرفتاری کا وارنٹ آنے کے بعد مولانا ہی جیسا صاحب عزیمت آدمی کوئی اثر نہیں لے سکتا تھا اور واقعتہً انہوں نے کوئی اثر نہیں لیا۔نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے سارے معمولات جن کے وہ عادی تھے انجام دیے،ایک بڑا ضروری بیان لکھنا تھا اس کو لکھا خطوط لکھے،غسل کیا کپڑے بدلے جب تمام ضروریات سے فارغ ہوگئے تو بصد شان وشوکت وبہزار جاہ وجلال اپنے میزبان کے گھر سے برآمد ہوئے اور نہایت وقار وسکون کے ساتھ ڈپٹی کمشنر کی موٹر پر بیٹھ گئے،پھر مولانا کو پتہ نہیں چلا کہ وہ کن راستوں سے ہوتے

ہوئے ڈپٹی کمشنر کی معیت میں ریلوے اسٹیشن پہنچے اور پھر وہاں سے بذریعہ ریل شہر احمد نگر جو ڈھائی سال تک ان لایق صد ہزار عزت قائدین ملک وملت کا عارضی مسکن تھا، جن کے ہاتھوں میں آزاد ہندوستان کی باگ ڈور آنے والی تھی۔ ہندوستان کے اور شہروں مقامات اور عمارتوں کی طرح اس شہر اور اس کے قلعہ سے بھی صدیوں کے انقلابات و حوادث کی داستانیں وابستہ ہیں، جن کو اب تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق دفاتر میں محفوظ کر لیا ہے۔

بیفشاں جرعۂ برخاک و حال شوکت بیں
کہ از جمشید و کیخسر و ہزاراں داستاں دارد

تاریخ کے یہ اوراق مولانا کی نظر سے کبھی گزرے تھے، مولانا ابھی راستہ ہی میں تھے اور ریل تیزی کے ساتھ احمد نگر کی طرف دوڑی چلی جاری تھی، میدان کے میدان گزرتے تھے۔ ابھی ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ فوراً دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا۔ بالکل ایسا ہی ماجرا مولانا کے دماغ کے اندر بھی گزر رہا تھا، احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستان کہن سے ورق پر ورق الٹا جا رہا تھا۔ ایک صفحہ پر ابھی پورے طور پر نظر جمنے نہ پاتی کہ دُوسرا صفحہ سامنے آجاتا۔

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہاے سینہ را

بی بی زلیخا:

ان ہی گمنام لوگوں میں ایک بی بی زلیخا بھی ہیں، جو مولانا آزاد کی رفیقہ حیات تھیں، جن کے صبر و ثبات کی داستان مولانا نے نہایت دلسوزی کے ساتھ بیان کی ہے۔ یہ مولانا کے والد مولانا خیر الدین کے ایک مرید آفتاب الدین صاحب کی نور نظر تھیں۔ بڑی بہن مولانا کے بڑے بھائی مولوی غلام یسین آہ سے بیاہی تھیں مولانا قلعہ احمد نگر میں قید تھے کہ یہ کلکتہ میں بیمار پڑ گئیں مولانا کی عدم موجودگی میں ان کے علاج کی جو بھی ممکن صورتیں تھیں وہ سب اختیار کی گئیں لیکن بیماری روز بروز شدت پکڑتی چلی گئی یہاں تک کہ

زیست کی تمام امیدیں منقطع ہوگئیں۔مولانا کو جیل میں یہ تمام خبریں ملتی رہیں، مولانا چاہتے تو ایسے نازک موقع پر رہا بھی ہو جاتے، بہت سے لوگوں نے مولانا سے سفارشیں کیں خود سپرنٹنڈنٹ جیل نے بھی جو انگریز تھا اس کی خواہش کی، لیکن مولانا کی طبع غیور نے گورنمنٹ کے سامنے کسی طرح کی درخواست پیش کرنے کے ننگ کو گوارا نہیں کیا اور بی بی زلیخا کا کلکتہ میں انتقال ہو گیا۔ایک وفا پرست شوہر کے لیے یہ واقعہ جتنا جاں گداز ہوسکتا ہے وہ ظاہر ہے۔مولانا کی زندگی کا سارا نشاط ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا غبار خاطر کا سلسلہ تحریر بھی جو قلعہ احمد نگر میں آنے کے دوسرے ہی دن سے بڑے جوش وانبساط کے ساتھ شروع ہوا تھا رک گیا۔بلکہ پروفیسر اجمل خاں کی تو روایت ہے کہ اس حادثہ کا ان پر اتنا اثر تھا کہ وہ اس کے بعد گیارہ برس تک زندہ رہے، لیکن اس درمیان میں سوائے ضروری سرکاری تحریروں کے جن کا لکھا جانا ناگزیر تھا۔انھوں نے ایک حرف نہیں لکھا مولانا نے غبار خاطر میں فرط تاثر کی بنا پر ان مرحومہ کا ذکر نہ کیا ہوتا۔تو گھر کی چہار دیواری کے اندر کمال صبر وثبات کے ساتھ اپنی پوری زندگی گزار دینے والی عفیفہ کو کوئی آج جانتا بھی نہیں۔قومی زندگی کے رہ نماؤں میں اکثر کی بیویاں، بہنیں، لڑکیاں بلکہ ان کا پورا خاندان ان کے ساتھ قومی اسٹیج پر آ گیا، اور ان کا ذکر افسانہ بزم وانجمن بن گیا۔لیکن مولانا کی ان اہلیہ مکرمہ کا مولانا کے ساتھ گھر کی چہار دیواری سے نکل کر اسٹیج پر آنا تو بڑی بات ہے، ان کا ذکر تک غبار خاطر سے پہلے سننے اور پڑھنے میں نہیں آیا۔اس مخدرۂ عالیہ میں وہ تمام صلاحیتیں، محاسن اور اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے، جو مہذب اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین میں ہوسکتے ہیں بہت اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی تھیں، بلکہ انھوں نے مولانا کی ایک مرتبہ کی گرفتاری کے زمانہ میں گاندھی جی کو ایک طویل خط بھی لکھا تھا، مولانا جب تصنیف وتالیف میں مشغول ہوتے تھے تو یہ برابر ان کی خدمت میں حاضر رہتی تھیں پھر مولانا کی طویل رفاقت اور فیض صحبت سے ان میں جو جلا پیدا ہوگئی ہوگی وہ ظاہر ہے۔

مسیتا خاں:

انہی میں ایک مسیتا خاں بھی ہے جس کا ذکر مولانا نے غبار خاطر کے اس آخری

خط میں جو اس کے دوسرے ایڈیشن میں چھپا ہے، بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ مولانا کتب بینی کے شوق میں ولزلی اسٹریٹ میں خدا بخش نام کے ایک کتب فروش کی دکان پر اکثر جایا کرتے تھے وہ زیادہ تر عربی و فارسی کی قلمی کتابوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔ ایک دم اس نے مولانا کو فقیر سیف اللہ خاں کی راگ درپن کا ایک نہایت خوشخط اور مصور نسخہ دکھایا اور کہا یہ کتاب فن موسیقی میں ہے۔ مولانا وہ کتاب گھر لائے اور اول سے آخر تک اس کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالا، لیکن معلوم ہوا کہ جب تک موسیقی کی مصطلحات پر عبور نہ ہو اور کسی ماہر فن سے اس کی مبادیات سمجھ نہ لی جائیں، کتاب کا مطلب سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اب جو یہ رکاوٹ پیدا ہوئی تو مولانا کو سخت الجھن ہوئی اور خیال ہوا کہ کسی واقف کار سے مدد لینی چاہیئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ مدد لی جاتی تو کس سے لی جاتی، خاندانی زندگی کے حالات ایسے تھے کہ اس کوچہ سے رسم و راہ رکھنے والوں کے ساتھ ملنا آسان نہ تھا، آخر مولانا کا خیال مسیتا خاں کی طرف گیا اس پیشہ کا یہی ایک آدمی تھا، جس کا گزر مولانا کے یہاں تھا، یہ سونی پت ضلع انبالہ کا رہنے والا تھا، اور خاندانی گویا تھا۔ گانے کے فن میں اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی، دہلی اور جے پور کے استادوں سے تحصیل کی تھی، کلکتہ میں طوائفوں کی معلمی کرتا تھا، یہ مولانا کے والد مرحوم کی خدمت میں بیعت کے لیے حاضر ہوا اور کچھ دنوں کی ریاضت کے بعد حلقۂ ارادت میں داخل ہو گیا۔ اور طوائفوں کی معلمی سے توبہ کر لی اور ایک بنگالی زمیندار کے یہاں ملازم ہو گیا روز روز کی آمد اور حضوری سے اس کے مولانا سے بھی تعلقات ہو گئے تھے۔ مولانا نے ایک دن اپنی اس خلش کا ذکر اس سے کیا پہلے تو اسے کچھ حیرانی ہوئی لیکن جب معاملہ پوری طرح اس کی سمجھ میں آ گیا تو بہت خوش ہوا کہ مرشد زادے کی نظر توجہ اس کی طرف مبذول ہوئی ہے، لیکن اب مشکل یہ تھی کہ یہ تجویز عمل میں لائی جائے تو کیسے لائی جائے، گھر میں جہاں ہدایہ اور مشکوٰۃ کے پڑھنے والوں کا مجمع رہتا تھا اور قال اللہ و قال الرسول کا نغمۂ شیریں فردوس گوش تھا، وہاں سارا گاما کی سبق آموزیوں کا کہاں موقع تھا! بہر حال مولانا کو گوشۂ تنہائی مل گیا، اور انھوں نے مسیتا خاں سے علم موسیقی کی تحصیل شروع کر دی، لیکن اس کا طریقۂ تعلیم وہی رٹا رٹایا ہوا

تھا۔ جو اس فن کے عام استادوں کا ہوتا ہے، مولانا اس کے طریقہ تعلیم سے بالکل مطمئن نہیں ہوئے اور اس فن کو ازخود حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی، جس میں ان کو کامیابی ہوئی اور کچھ دنوں کے مطالعہ، مشق و ممارست اور آلات موسیقی کے براہ راست استعمال سے اس فن پر پورا عبور ہوگیا، مقصود اس اشتغال سے صرف یہ تھا، کہ طبیعت اس کوچہ سے ناآشنا نہ رہے، جب ایک خاص حد تک یہ مقصد حاصل ہوگیا تو پھر مزید اشتغال نہ صرف غیرضروری تھا، بلکہ موانع کار کے حکم میں داخل ہوگیا۔ اگر مولانا نے خود اس کا ذکر نہ کیا ہوتا تو کون باور کرسکتا تھا کہ مولانا فقہ و حدیث و تفسیر اور دوسرے علوم دینیہ و عقلیہ کے ساتھ علم موسیقی سے بھی واقف تھے، اور ایک مستعد طالب علم کی طرح اس کی باقاعدہ تحصیل کی تھی اور کچھ دنوں کیا برسوں ستار و عود رباب کا بھی شغل رکھا تھا، مولانا لکھتے ہیں:

''موسیقی کے آلات میں زیادہ تر توجہ ستار پر ہوئی، اور بہت جلد اس سے انگلیاں آشنا ہوگئیں اس کی مشق چار پانچ سال تک جاری رہی تھی۔ بین سے بھی انگلیاں ناآشنا نہیں رہیں، لیکن، زیادہ دلبستگی اس سے نہ ہوسکی۔۔۔۔ البتہ انگلی پر سے مضراب کا نشان بہت دنوں تک نہیں مٹا تھا۔

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

غلام یٰسین آہ:

مولانا نے غبار خاطر میں اپنی تعلیم کے سلسلہ میں بغیر نام لیے ہوئے اپنے بڑے بھائی کا بھی ذکر کیا ہے، ان کا نام ابوالنصر غلام یٰسین آہ تھے۔ یہ مولانا سے بڑے تھے۔ لیکن دونوں ایک ساتھ اپنے والد مولانا خیرالدین اور ان کے مقرر کردہ اساتذہ سے گھر پر تعلیم حاصل کرتے تھے اور غالباً ایک ساتھ فارغ التحصیل ہوئے۔ مولانا ندوہ میں ایک سال یا چھ مہینے کے قیام کے بعد جب وکیل امرتسر میں گئے، تو یہ بھی کلکتہ سے وہاں پہنچ گئے۔ ان کا وہاں کیا مشغلہ تھا اس کا کچھ پتہ نہیں لیکن جب مولانا عراق اور مشرق وسطی کی سیاحت کے لیے امرتسر سے روانہ ہوئے تو یہ بھی ان کے ساتھ تھے، لیکن یہ عراق پہنچتے ہی کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوگئے۔ اور تنہا وہاں سے بمبئی چلے آئے، بمبئی میں ان کا ہر قسم کا

علاج کیا گیا۔ لیکن وہ اس سے جانبر نہ ہو سکے اور اسی عالم غربت میں ان کا انتقال ہو گیا ، جس کا ان کے والد مولانا خیر الدین کو سخت صدمہ ہوا۔ بلکہ اپنے ان بڑے بیٹے کی ابدی جدائی کے غم میں کچھ دنوں کے بعد وہ بھی وفات پا گئے۔ مولانا اس وقت عراق کی سیاحت سے واپس امرتسر آ چکے تھے۔ والد کی علالت کی خبر سنی تو فوراً ان کی خدمت اور تیمارداری کے لیے کلکتہ روانہ ہو گئے اور مولانا خیر الدین نے ان کو اپنا ولی عہد اور جانشین بنایا۔

ابوالنصر مولانا ہی کی طرح بڑے ذہین، طباع اور حوصلہ مند تھے، شاعر تھے اور آہ تخلص کرتے تھے۔ کلکتہ کے مشاعروں میں وہ بھی شریک ہوتے تھے اور طرح میں اپنی کہی ہوئی غزلیں پڑھتے تھے اور خراج تحسین حاصل کرتے تھے۔ دست برد زمانہ سے ان کا جتنا کلام محفوظ رہ گیا ہے اس کو جناب عبدالقوی صاحب دیسنوی نے شائع کر دیا ہے مولانا کی وفات سے پہلے مولانا پر جو کتابیں اور مضامین اردو یا انگریزی میں لکھے گئے۔ ان میں شاید ہی ان کے ان بھائی کا کسی تقریب سے ذکر آیا ہو والدین کا حال تو سب نے بڑی تفصیل سے لکھا، خود مولانا نے غبار خاطر سے پہلے ۱۹۱۹ء میں تذکرہ میں لکھا، لیکن بھائی کا ذکر کہیں نہیں آیا، جو ایک حیرت انگیز بات ہے۔

سب سے پہلے ان کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا کے رسالے الندوہ سے تعلق کے سلسلہ میں حیات شبلی میں کیا، لکھتے ہیں:

> ''آخرکار وہ (مولانا ابوالکلام) ۱۹۰۶ء میں ''وکیل'' امرتسر میں چلے گئے اور قریباً دو سال وہاں رہے ہوں گے، اسی اثناء میں ان کے بڑے بھائی مولوی ابوالنصر غلام یٰسین صاحب آہ کا عراق میں جہاں وہ سیر و سیاحت کے لیے گئے ہوئے تھے، انتقال ہوا اور اس کے بعد ہی ان کے والد ماجد مولانا خیر الدین صاحب نے جن کے بمبئی اور کلکتہ میں ہزارہا مرید تھے، وفات پائی رحلت کے وقت انھوں نے مولانا ابوالکلام کو بلوا کر اپنا جانشین بنایا''۔ (ص ۴۴۴-۴۴۵)

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال تھا کہ عراق کی سیاحت کے لئے جو

دونوں جوان امرتسر سے نکلے تھے ان میں ایک یہی مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی مولوی ابوالنصر غلام یٰسین آہ تھے اور دوسرے مولانا عبدالرحمٰن امرتسری تھے جن کے عربی صرف ونحو کے اُردو رسالے ہدایۃ الصرف اور ہدایت النحو بہت عرصہ تک بعض عربی مدارس میں متداول تھے انھوں نے اپنا سفرنامہ لکھا تھا مولوی ابوالنصر کا اسی سفر میں یا واپسی میں انتقال ہوگیا اور مولانا ابوالکلام نے وکیل امرتسر میں جس کے وہ ایڈیٹر تھے ان کا بڑا دلدوز مرثیہ لکھا افسوس ہے کہ خود مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے قلم سے ان تمام واقعات پر روشنی نہیں ڈالی اور بدقسمتی سے ان کی زندگی کا یہ واقعہ بھی اختلاف آرا کا مرکز بن گیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ سفر عراق سے متعلق مولانا کے غبار خاطر وکاروان خیال کے بیانات کی تائید میں بجائے عراق کے علماء فضلاء اور ادباء اور ان عرب خاندانوں کے افراد کے بیانات کے جن کے مولانا اپنے دوران سفر میں مہمان تھے اور جن میں سے ایک خاندان کے افراد کی خدمتوں اور مہمانداریوں کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ غبار خاطر میں بھی کیا ہے ایک غیر مسلم یورپین سیاح کی شہادت پیش کی جارہی ہے جو انہی دنوں عراق کی سیاحت کے لیے آیا تھا اور مولانا سے ملا تھا۔ لسان الصدق اور الندوہ کے بعض مضامین اور تراجم کے ذریعہ مولانا ہندوستان کے ایک خاص حلقہ میں متعارف ضرور ہوگئے تھے۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری دور کی طرح عالم گیر شہرت کے مالک نہیں ہوئے تھے کہ ان کو دیکھنے اور زیارت کے لیے لوگ آتے انھوں نے گمنامی کے زمانہ ہی عراق کا سفر کیا تھا اگر ہندوستان کے ایک عالم کی حیثیت سے ان سے کوئی مل سکتا تھا تو وہ عراق کے علما، ادبا، شعرا، مدرسوں اور کالجوں کے اساتذہ مختلف دینی وادبی دوائر کے رہنما ہی ہوسکتے تھے لیکن ان میں سے کسی ایک کے خاندان کی شہادت بھی پیش نہیں کی جاسکی اور پھر اس کی شہادت کی آخر خواہ مخواہ ضرورت کیا ہے۔ جب مولانا خود کہتے ہیں کہ انھوں نے عراق کا سفر کیا تھا فلاں فلاں جگہ ٹھرے تھے یہ یہ واقعات پیش آئے تھے اور ایک پورا جاڑا انھوں نے موصل میں گزارا تھا تو اس میں شک وشبہ کی کیا بات ہے؟ لیکن اس سلسلہ میں ایک غیر مسلم کی وہ بھی ایک فرانسیسی مستشرق کی شہادت کتنی عجیب بات ہے۔

ہمارے نزدیک اس سیاحت عراق کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے
انھوں نے کل ۱۸۔۱۹ برس کی عمر میں عراق کا سفر کیا تھا گئے اور گھوم گھام کر چلے آئے نہ
اس کا کوئی مقصد تھا نہ انھوں نے ان پرائیویٹ خطوط کے علاوہ جو مولانا حبیب الرحمٰن خاں
شروانی کو لکھے تھے اور جو غبار خاطر اور کاروان خیال میں شائع ہو گئے ہیں کہیں اس کا ذکر
کیا، نہ کبھی اس کی روداد ضبط تحریر میں لائے اس لیے اس موضوع پر بحث و مباحثہ غیر
ضروری ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کو جنھیں ہم فنی ہم ذوقی ہم پیشگی کی وجہ سے مولانا
کے ایک ایک پروگرام کی خبر رہتی تھی، اتفاق سے اس سفر کی خبر نہ ہو سکی، مولانا آزاد نے
شاید پہلے کاروان خیال میں اور اس کے بعد کسی قدر اور تفصیل کے ساتھ ضمناً غبار خاطر
میں اس کا ذکر کیا۔ تو ان کو بڑا تعجب ہوا اور لکھا کہ اگر مولانا اس کے ساتھ اس سفر کی تاریخ
بھی قلم بند کر دیتے تو ان کے مخلص سوانح نگار ان کی سوانح عمری کے چوکھٹے میں اس کو
مناسب جگہ پر جڑ سکتے۔ بات معقول تھی مولانا نے سید صاحب کی اس عرضداشت کی طرف
کوئی توجہ نہیں فرمائی اور خود اپنے قلم سے اس سفر کا سنہ اور تاریخ تعین نہ کر سکتے۔ اور دنیا
سے تشریف لے گئے۔ مولانا کی زندگی کا کوئی واقعہ بغیر سنین و شہور اور روز و تاریخ کی قید
کے لکھا کیسے جا سکتا ہے اور پھر ایسی سوانح عمری کس طرح مستند اور قابل اعتماد ہو سکتی ہے
مولانا سید سلیمان رحمہ اللہ نے ''حیات شبلی'' جیسی بھی لکھی ہو لیکن اس میں شبلی کی زندگی کا
کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی بغیر سنہ مہینہ اور تاریخ کی قید کے نہیں لکھا ہے اور یہ ایک
سوانح نگار اور مورخ کا سب سے بڑا فرض ہے۔ یہی اہتمام وہ مولانا جیسی وقت کی اہم
اور ہمہ گیر شخصیت کی سوانح عمری کے لیے بھی چاہتے تھے، اور اسی نقطۂ نظر سے مولانا کے
سفر عراق کے متعلق ان کو تردد و تامل تھا اگر مولانا اپنی زندگی میں ہندوستان کے ایک بڑے
سوانح نگار مورخ کی مخلصانہ عرضداشت کو جس کے سرمایہ تحریر میں ''سیرۃ النبی'' کی چھ ضخیم
مقدس جلدوں کے علاوہ ''خطبات مدراس''، ''رحمت عالم''، ''سیرت عائشہؓ''، ''ارض
القرآن''، ''حیات امام مالک'' وغیرہ جیسی بلند پایہ کتابیں بھی ہیں، قبول فرما لیا ہوتا اور

اپنے قلم حقیقت رقم سے اس سفر کا سنہ اور تاریخ تحریر فرما دیتے تو نہ صرف سید صاحب کا شک وتردد رفع ہو جاتا، بلکہ ایک حقیقت تحریر میں آ جاتی۔ لیکن انھوں نے کاروان خیال اور غبار خاطر میں اپنے سفر عراق وایران ولبنان کے متعلق جو تاثرات ومشاہدات ضمناً لکھے تھے اس پر ایک حرف کا اضافہ نہ کر سکے۔

مولانا ابوالکلام نے تو اپنے خطوط کے دونوں مجموعوں میں ایک ہی مرتبہ اپنے سفر عراق کا ذکر کیا تھا اور وہی ان کی زندگی میں بعض لوگوں کے نزدیک جوان سے واقف تھے اور ان کی زندگی کے ایک ایک واقعہ سے دلچسپی رکھتے تھے، محل نظر بن گیا اور اس پر ان کی زندگی میں اور ان کی زندگی کے بعد بھی خوب خوب مضامین لکھے گئے اور ان میں زور قلم صرف کیا گیا، لیکن ہمارے مخدوم جناب مالک رام نے اپنی مرتب کردہ غبار خاطر کے نئے ایڈیشن میں جوان کے بیش قیمت حواشی وتعلیقات کے ساتھ ساہتیہ اکادیمی دہلی کی طرف سے نہایت نفیس لکھنو میں شائع ہوا ہے، ایک جگہ حاشیہ میں دو مرتبہ سفر عراق کا ذکر کیا ہے۔ ایک ۱۹۰۵ء میں جبکہ وہ مولانا شبلی کے ساتھ ندوہ میں یا امرتسر میں رہے ہوں گے، دوسرا اگست ۱۹۰۸ء میں۔ جس میں مولانا آزاد کے والد مولانا خیر الدین کا انتقال ہوا تھا۔ اور وہ انتقال کے بعد عراق روانہ ہو گئے اگر وہ اپنے والد کے انتقال کے فوراً بعد عراق جانے کا ارادہ رکھتے تھے تو اپنے اس شکایتی خط میں جو انہوں نے مولانا شبلی کو اپنے والد کی وفات پر ان کے کوئی تعزیتی خط نہ لکھنے پر لکھا تھا، اپنے اس ارادہ کا اظہار ضرور کیا ہوتا، وہ خط یہ ہے:

۲۶-۸-۱۹۰۸

خواہی کہ تبو بیش شود شوق نظیری
از پیش خودش گاہ براں گاہ نظر دار

آقائے من! آج پرانے کاغذات میں لفافے ڈھونڈ رہا تھا، آپ کے چند خطوط اور کارڈ نکل آئے، میں پھر ایک مرتبہ اسی تمنا زار میں پہنچ گیا، جہاں کسی کی نگہ ارادت نواز مایہ حیات تھی۔ والد کے انتقال کو آج دسواں روز ہے، اخبارات میں بھی

تذکرہ آچکا ہے، مگر آپ نے تعزیت کی ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ دل ارادت وعقیدت سے اسی طرح لبریز ہے جیسا کہ پہلے تھا اور انشاء ہمیشہ رہے گا۔

از طور صلح و عربدہ بیگانہ ام ہنوز
بر آتشے نساختہ پروانہ ام ہنوز

معلوم نہیں آپ کہاں ہیں؟ حافظ عبدالرحمٰن راوی تھے کہ عرصہ تک آپ کی امید نہیں۔ بہرکیف میں تو چہلم کے بعد بمبئی پہنچتا ہوں اور وہاں سے جہاں آپ ہوں:

دل نے ملا دیں خال میں سب وضع داریاں
جوں جوں رکے وہ ملنے سے ہم بیشتر ملے

ابوالکلام

اس میں مولانا شبلی سے ملنے کے اشتیاق کے اظہار کے ساتھ اپنے بمبئی پہنچے اور پھر وہاں سے جہاں مولانا شبلی ہوں وہاں پہنچنے کے ارادہ کا ذکر تو بہت واضح الفاظ میں ہے لیکن سفر عراق کا جوان کی زندگی کا اہم واقعہ بن گیا ہے۔ اس کی طرف اشارہ تک نہیں ہے۔

ہمارے خیال میں مالک رام صاحب کو سہو ہو گیا ہے، مولانا ابوالکلام نے اپنی پوری زندگی میں ایک ہی مرتبہ ان کے اپنے بیان کے مطابق عراق کا سفر کیا ہے اور اسی کے دوران میں موصل، لبنان اور محض ایرانی علاقوں کی سیر کی تھی اور اسی سفر میں شیخ آلوسی اور بعض دوسرے مشاہیر سے ملاقاتیں کی تھیں، موسیو ماسینون سے بھی خاص شہر بغداد میں جہاں وہ غالباً سیاحت کے لئے آئے ہوں گے، ملاقات ہوئی ہوگی۔ جس کی تصدیق خود مالک رام نے پیرس میں ان سے ملاقات کر کے کر لی ہے، یہ موسیو ماسینون کون بزرگ ہیں، ان کی علمی وادبی وسیاسی حیثیت کیا ہے اور ہندوستان کے اس نوعمر سیاح سے جس کو خود اپنے ملک میں اس وقت تک کوئی شہرت حاصل نہیں تھی۔ الہلال وغیرہ کا اجرا جوان کی شہرت کا بہت بڑا ذریعہ تھا، اس کے سالوں بعد ۱۹۱۳ء میں عمل میں آیا تھا۔ ملنے کی کیا ضرورت پیش آئی اور اس ملاقات میں دونوں ایک دوسرے سے کس حد تک متاثر ہوئے۔ ان سب پر افسوس ہے کہ مالک رام صاحب نے تفصیل سے روشنی نہیں ڈالی۔

حالانکہ یورپ کے بعض بعض مستشرقوں کا ان خطوط میں نام آیا ہے، حواشی میں بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ حیرت ہے کہ خود مولانا نے بھی اپنے خطوط میں جہاں عراقی علماء کا ایک ایک کر کے ذکر کیا ہے، فرانس کے اس مستشرق کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ جو بغداد میں ان کی شہرت کا آوازہ سن کر ان سے ملنے آیا تھا۔

اس سفر میں اپنے عزیز ترین بھائی کی جن کی محبت میں وہ امرتسر سے روانہ ہوئے تھے۔ اچانک علالت کا اور پھر اسی حالت میں عراق سے ان کی واپسی کا اور بمبئی میں ان کے علاج اور پھر آخر میں کلکتہ میں ان کے انتقال کا حال سرے سے لکھا ہی نہیں جو ان کے سفر ہی کا نہیں بلکہ ان کی زندگی کا اہم واقعہ تھا۔ ایک بھائی کی زندگی سے محرومی سے بڑھ کر، جس کے علاوہ اور کوئی دوسرا بھائی نہیں تھا، ان کے لئے اندوہ ناک اور سخت واقعہ اور کون ہوسکتا ہے:

این ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

مگر انہوں نے اپنی تحریروں میں اشارۃً و کنایۃً بھی اس سفر میں اپنے عزیز ترین بھائی کی شرکت کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔

بہر حال مولانا کے والد مولانا خیرالدین کی نسل دنیا میں انہی کے بھائی مولوی ابوالنصر غلام یٰسین آہ سے جاری ہے۔ مولانا کے بھتیجے نورالدین جو مولانا کی علالت کے زمانہ میں مولانا کے تیماردار تھے اور جن کی موجودگی میں مولانا کا انتقال بھی ہوا، وہ مولانا کے انہی بھائی کے خلف الرشید ہیں، اور مولانا کے ساتھ مستقل طور پر رہتے تھے۔ مولوی ابوالنصر صاحب کی ایک صاحبزادی لکھنؤ میں ہیں مولانا ۱۹۴۵ء میں قلعہ احمد نگر جیل سے رہا ہونے کے بعد پہلی مرتبہ لکھنؤ گئے تھے تو ان صاحبزادی کے یہاں بھی تشریف لے گئے تھے، ان کا چھوٹا بچہ نانا، نانا کہتا ہوا مولانا کے آغوش میں آ کر بیٹھ گیا اور داڑھی کے بالوں سے کھیلنے لگا۔ مولانا کے پاس اس وقت کیا تھا کہ نواسہ کو دیتے۔ صرف ۱۰۰ سو روپیہ کا ایک نوٹ اوس کو مٹھائی کھانے کے لئے دے دیا۔ انہی مولوی ابوالنصر کے ایک صاحبزادے اور تھے، جن کا نام بدرالدین تھا۔ ان کا عین عالم جوانی میں انتقال ہوگیا تھا۔ "ہند جدید"

کلکتہ نے اپنے بانی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی یادگار میں کتابی شکل میں ایک خاص نمبر نکالا تھا۔ جو ہر اعتبار سے بڑا شاندار تھا، اس میں ایک گروپ عبدالرزاق کے ساتھ بدرالدین مرحوم کی بھی تصویر ہے۔ مولانا عبدالرزاق جو اس وقت دفتر الہلال سے متعلق تھے، ایک کرسی پر بیٹھے ہیں اور یہ ان کی محفل میں نہایت نفیس سیاہ شیروانی میں ملبوس سرو قد کھڑے ہیں، خاندانی، ذہانت، جودت، ذکاوت ان کی ہر ہر چیز سے نمایاں ہے۔ یہ مولانا ہی کی طرح بلند قامت وجیہہ اور خوبصورت تھے، اور مولانا ہی کے ساتھ رہتے تھے مولانا سے بڑی دو بہنیں بھی تھیں، جو بھوپال میں رہتی تھیں۔ ان میں سے ایک بحمداللہ زندہ ہیں۔ انہی نے مولانا پر ماہ نامہ ''آج کل'' دہلی میں ایک چھوٹا سا مضمون لکھا تھا۔ اس میں مولانا کے مطالعہ میں انہماک واستغراق کے متعلق ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔

مولانا بچپن ہی سے مطالعہ و کتب بینی کے شائق تھے، بلکہ زندگی کا سب سے دلچسپ مشغلہ ان کا یہی تھا۔ برابر نئی کتابوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ بچپن ہی کی عمر میں ایک کمرہ میں جس میں روپوں کا صندوق بھی رکھا تھا۔ مطالعہ میں غرق تھے کہ کسی طرح سے چور کمرے میں داخل ہوا، بکس کھولا اور سارا اندوختہ اٹھا کر چل دیا، مولانا کو خبر تک نہ ہوئی۔

عام طور پر لوگوں کے ہوش وآگہی کا زمانہ ۲۰ یا ۲۲ برس کے بعد شروع ہوتا ہے، مبداء فیاض کی بخشش خاص نے تیرہ چودہ برس کی عمر میں اس مرحلہ سے ان کو گزار دیا تھا، اور اسی عمر میں وقت کے بڑے بوڑھوں سے آنکھیں ملانے لگے تھے اور حالی وشبلی سے خط وکتابت شروع کر دی تھی۔ حالی کی مشہور روزگار کتاب حیات جاوید شائع ہوئی تو اس عمر میں خط لکھ کر آگرہ سے منگوائی اور اس کا ایک ایک حرف پڑھ ڈالا اور غالباً لسان الصدق میں جو ان کا ذاتی رسالہ بھی تھا۔ اس پر ریویو لکھا، سرسید کی عقلیات کا ایک زمانہ تک جوان کے دل ودماغ پر اثر رہا، اس میں سرسید کے تہذیب الاخلاق کے مضامین وتصنیفات کے علاوہ اس کتاب کے مطالعہ کا بھی غالباً دخل تھا، لیکن یہ اثر رفتہ رفتہ از خود زائل ہو گیا اور وہ سرسید کے سب سے بڑے مخالف ہو گئے۔

تحریر و اسلوبِ تحریر

مولانا ابوالکلام آزاد
کا
اسلوبِ تحریر

مولانا ابوالکلام آزاد جس طرح اور بہت سے اوصاف میں منفرد تھے، اسی طرح اپنے اسلوب تحریر کے اعتبار سے بھی یگانہ تھے، جو نہ صرف وہبی اور خداداد تھا، بلکہ اس وقت جتنے اسالیب تحریر اردو میں رائج تھے، اور جن کا تتبع ہورہا تھا، اور جن میں وقت کی بڑی بڑی تصنیفات تھیں، ان سب سے یگانہ تھا، جس کے وہ خود خلاق تھے، جس کا کوئی بھی ہزار کوشش کے باوجود تتبع نہ کرسکا۔ اس میں بیک وقت آزاد، نذیر احمد، حالی، شبلی، سب کی خصوصیات جمع ہوگئی تھیں، اس میں شبلی کا زور تھا، حالی کی سادگی تھی، نذیر احمد کا بانکپن تھا، محمد حسین آزاد کی رنگینی تھی، اور اس سب کے ساتھ قرآن وحدیث سے استدلال واستشہاد تھا، وہ جو چیز بھی پیش کرتے تھے، قرآن کی روشنی میں پیش کرتے تھے، اس میں ایسا جادو ہوتا تھا کہ جو بھی پڑھتا تھا، اس سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات، جس پر اب تک کسی کی نظر نہیں پڑی، یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام ایک ذاعی مذہب، عالم دین، مبلغ کتاب وسنت کی حیثیت سے منظر عام پر آئے تھے، لیکن انہوں نے جو اخبار نکالا، وہ وقت کے تمام اخبارات ورسائل سے بالکل منفرد تھا۔ چھپتا وہ بھی لیتھو میں نہیں، جس کے لوگ اب تک پڑھنے کے عادی تھے، بیروت کے دیدہ زیب نسخ ٹائپ میں چھپتا تھا جو سب کے لئے ایک عجیب تھا۔ پھر وہ رنگین وباتصویر بھی تھا، جو یکسر اسلام کی تعلیمات وہدایات کے منافی سمجھا جاتا تھا، اس میں ایک مرتبہ ایک

حسین وجمیل عورت کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی، جس کے ہاتھ میں خنجر تھا، اس کے نیچے لکھا تھا:

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

لیکن لوگوں کا خیال تصویروں کے جواز وعدم جواز کی طرف نہیں گیا، بلکہ قرآن وحدیث کے رنگ میں جو چیز اس کے صفحات میں پیش کی جارہی تھی، اس کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول تھی۔ اس میں بیک وقت تصویریں بھی ہوتی تھیں، جن کے بارے میں عام طور پر مسلمانوں کا خیال تھا کہ ان کی اسلام اجازت نہیں دیتا، اور تفسیری نکات وغوامض بھی، یہ بھی ابوالکلام کا اعجاز تھا، کسی حلقہ سے بھی یہ آواز نہیں اُٹھی کہ قرآن وحدیث کو یکسر حرام چیز کے ساتھ کیوں ملوث کیا جارہا ہے، حالانکہ اس کے پڑھنے والوں میں رندان قدح خوار بھی تھے اور وقت کے زہاد واتقیاء بھی، اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب جیسے بزرگانِ دین اور فقیہانِ مذہب بھی وہ بھی تھے جو محرمات ومحظورات تو الگ رہے، بدعات ومحدثات تک کو برداشت نہیں کرسکتے تھے (مثلاً میرے ایک ابتدائی فارسی وعربی کے استاد مولوی خدا بخش صاحب مرحوم امام جماعت اہل حدیث اعظم گڑھ، ان کا حال یہ تھا کہ بایں زہد وتقویٰ وتقشف واہل حدیثیت، جب تک اس کا ایک ایک حرف پڑھ نہیں لیتے تھے، کسی کو دیتے نہیں تھے، نہ کوئی اس دوران ان سے مانگنے کی ہمت کرسکتا تھا۔ وہ جب ڈاک سے آتا تھا، تو ایسا لپک کر ڈاکیے کے ہاتھ سے لیتے تھے، کہ گویا کوئی صحیفۂ آسمانی کوئی فرشتہ لے کر آیا ہے) لیکن اس کی اس بدعت پر جو حرام کے درجہ پر تھی، مولانا خدا بخش جیسے مرتاض، قائم اللیل وصائم الدہر، اور کتاب سنت کے سخت ترین عامل تک کی نظر کی گئی، جب تک وہ نکلتا رہا، مصور ہی نکلتا رہا، اور آخر تک مقبول رہا، قدردانوں نے اس کی مطلا ومذہب جلدیں بندھوائیں، ان کو کتب خانوں کی زینت بنایا، اس کے پورے فائل کو مولانا کے طرز تحریر کے پرستاروں اور شائقین نے ایک ایک ہزار روپے میں خریدا، جس کے پاس بھی اس کا مکمل فائل موجود ہے، اس کو حرز جاں بنائے ہوئے ہے اور کسی قیمت پر اس کا جدا کرنا پسند نہیں کررہا ہے، اور جوں جوں زمانہ گزرتا جائے گا، اس کی قدر وقیمت بڑھتی چلی جائے گی، یہ عزت، یہ شرف، یہ قدر افزائی، کسی اردو رسالہ اور اخبار کو آج تک

حاصل نہیں ہوئی، اس کے منتخب مضامین کے کتنے مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اور ناشروں نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا ہے، خود مولانا ابوالکلام پر کتنوں نے پی، ایچ، ڈی کیا ہے، اور کتنوں کا ابوالکلامیات موضوع ہو گیا ہے، جس میں سرفہرست یہی الہلال ہے، جس کا سحر حال اب تک کام کر رہا ہے، ان پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں، مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ رسالوں اور اخباروں کے خاص نمبر نکالے جا رہے ہیں۔ سیمینار ہو رہے ہیں، ان پر ایک سے ایک بڑھ کر مقالے پڑھے جا رہے ہیں، پاکستان میں تو الہلال کے چار برس کے پورے فائل کا عکسی ایڈیشن چھاپ دیا گیا ہے، جس کے مولانا عمر بھر مخالف رہے ہیں، غالب واقبال کے بعد، سب سے زیادہ توجہ انہی کی شخصیت اور لٹریچر پر کی گئی ہے، اور ساہتیہ اکادیمی دہلی نے ان کی تمام تصنیفات کی طبع و اشاعت کا منصوبہ بنا رکھا ہے، اور وہ ان کی تفسیر ترجمان القرآن کی ایک جلد جو تمام تر سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر مشتمل ہے، (۱) ٹائپ میں، ان کے رانچی کے زمانۂ نظر بندی کی ایک قیمتی یادگار ''تذکرہ'' اور قلعہ احمد نگر جیل کے چند سالہ قیام کی دوسری یادگار غبار خاطر، جن کو مالک رام نے ایڈیٹ کیا ہے، لیتھو میں شائع بھی کر چکی ہے، پھر بھی ابھی تک ان کی شخصیت کا پورا احاطہ نہیں کیا جا سکا ہے اور ان کی زندگی کے کتنے پہلو ہیں، جو منظر عام پر آنے کے لئے ارباب ذوق کی نگہ التفات کے منتظر ہیں۔

مولانا کا سرمایہ قلم اگرچہ بہت مختصر ہے، اور محض تفسیر ترجمان القرآن کی دو جلدوں، تذکرہ، غبار خاطر، کاروان خیال، الہلال والبلاغ کے مضامین مختلف، قومی، ملی و سیاسی مجلسوں کے خطبہ ہائے صدارت اور تقریروں پر مشتمل ہے، پھر بھی جتنا کچھ ہے، اردو ادب کا بیش بہا اور قابل فخر سرمایہ ہے، جس کو کوئی مورخ اردو ادب کی تاریخ لکھتے وقت نظر انداز نہیں کر سکتا، ان کے علمی معاصرین میں کسی کو ان کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں، ان کا اردو ادب میں پایہ بہت بلند ہے، اور وہ بہت ہی شگفتہ اردو لکھتے تھے، اور لکھنو کے دبستان اردو کے تو پورے ترجمان تھے، ان کی شہرہ آفاق کتاب ''فلسفہ جذبات'' کی ایک انگریزی اصطلاح کو حظ و کرب اور لذت والم سے

تعبیر کرتے ہیں، الہلال کے صفحات میں ان دونوں ناموروں میں خوب معرکہ آرائی ہو چکی ہے، اور دونوں ہی نے اپنے اپنے قلم کی خوب خوب جولانیاں دکھائی ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا بادی کو'' حظ وکرب'' پر اصرار تھا، اور مولانا ابوالکلام آزاد ان کے مقابلہ میں ''لذت والم'' کے لئے بضد تھے، ان میں سے کوئی بھی اپنے موقف سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں تھا، یہاں تک کہ یہ بحث یوں ہی معلق رہ گئی، اور کوئی فیصلہ نہ ہوسکا، لیکن ارباب ذوق نے جوان دونوں کے ادب سے دلچسپی رکھتے تھے، اس سے خوب لطف اٹھایا، بہت زمانہ کے بعد عبدالماجد دریا بادی نے مولانا کے سامنے سپر ڈال دی، اوران کو معذرت اور شرمساری کا خط لکھا کہ آپ نے انگریزی اصطلاح کے جو مترادفات تجویز فرمائے تھے، یعنی ''لذت والم'' وہی صحیح ہیں۔ ایک زمانہ میں خود مصنف کو اپنی اس کتاب پر بڑا ناز تھا اور بجا ناز تھا کہ وہ اپنے موضوع پر بہت مکمل تھی اوران کے وسیع مطالعہ اور غور وفکر کا نتیجہ تھی، اور ملک نے اسی اعتبار سے اس کا خیر مقدم بھی کیا اور ہر حلقہ میں بہت پسند کی گئی، بلکہ ادبی دنیا میں ان کی شہرت کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی، لیکن جب سے ان پر ایک عرصہ کے الحاد و بے دینی کے بعد، دین داری و خدا پرستی کے جذبہ کا غلبہ ہوا ہے، اپنی اس شاہکار کتاب کو اپنی تصنیفات سے ہمیشہ کے لئے خارج کر دیا ہے اور مولانا ہی کے تتبع میں اپنی بقیہ عمر قرآن پاک کے انگریزی واردو ترجمہ اوراس کی تفسیر پر صرف کر دی۔ ان کی انگریزی واردو دونوں تفسریں مکمل ہیں اوران کی تکمیل کی حسرت اپنے ساتھ نہیں لے گئے، لیکن مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن، جوان کے قرآن کے وسیع مطالعہ وغور وفکر کا نتیجہ اور علوم ومعارف کی کتنی وادیوں کی سیر کا حاصل تھی، ناتمام رہ گئی، اور زندگی کی طویل فرصت کے باوجود وہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی، جوان کی علمی زندگی کی ایک ٹریجڈی ہے، جس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ کاش وہ وزیر تعلیم نہ ہوئے ہوتے، تو کیا عجب ہے کہ وہ پوری ہو جاتی اور دنیا کو قرآن کی تفسیر کبیر رازی اور روح المعانی اور کشاف کی طرح اردو زبان میں جس کے وہ بادشاہ تھے، ایک اچھی اور عمدہ تفسیر دے جاتے، اللہ تعالیٰ نے قلم اور زبان دونوں کے ذریعے سے اظہار وابلاغ و بیان کی جو

معجزانہ قوت ان کو ودیعت کی تھی، ان کے معاصرین میں کوئی بھی اس میں ان کا شریک و سہیم نہیں تھا۔ بولتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے اور لکھتے تھے صفحہ قرطاس پر موتی پردتے تھے۔ تقریر تحریر دونوں کے تتبع کی ہزار کوشش کے باوجود کوئی اب تک ابوالکلام ثانی پیدا نہ ہو سکا۔ تحریر میں سب سے زیادہ تتبع کی کوشش مشہور ماہر غالبیات مولانا غلام رسول مہر نے کی تھی، جو ان کی تحریک ''حزب اللہ'' کے ایک پرجوش داعی بھی تھے، مگر وہ بھی کامیاب نہ ہو سکے اور جو لوگ شریک ادارہ تحریر الہلال والبلاغ تھے وہ تو سرے سے ان کا اثر قبول ہی نہیں کر سکے، کہا جاتا ہے کہ ہنگامہ مسجد کانپور کے سلسلہ میں ۳۰۔ اگست کے الہلال کا اداریہ مشہد اکبر جو مولانا سید سلیمان ندوی کا لکھا ہوا ہے، ابوالکلام کے سحر کارانہ اسلوب میں ہے، غلط ہے۔

حاشیہ:

(۱) اب ترجمان القرآن بہ شمول سورۂ نور چار جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک اہم اضافہ مقدمۂ تفسیر کے بارھویں باب کا ایک حصہ ہے جو مولانا آزاد کے کاغذات میں دستیاب ہوا تھا۔ یہ مقدمہ ۱۹۱۶ء میں البلاغ پریس کلکتہ میں چھپ رہا تھا کہ مولانا کو کلکتہ سے خارج البلد کر دیا گیا اور پریس پر پولیس کے چھاپے میں مقدمہ کے مطبوعہ فارم دیگر کاغذات کے ساتھ پولیس کے قبضے میں چلے گئے۔ تقریباً پچاس صفحات کی ضخامت پر مشتمل بارھویں باب کا ایک حصہ محفوظ رہ گیا تھا۔ یہ ترجمان القرآن کی جلد اول میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مقدمۂ تفسیر کے تقریباً چھ سو صفحات چھپ گئے تھے۔ اسی طرح ترجمہ قرآن کا ایک حصہ بھی چھپ گیا تھا جو ضائع ہو گیا۔

ساہتیہ اکادیمی نئی دہلی نے ترجمان القرآن چہار جلد اور تذکرہ وغبار خاطر کے علاوہ خطوط ابوالکلام اور ''خطبات ابوالکلام'' دو مجموعے بھی شائع کیے ہیں۔ ان کے مرتب و مدون بھی مالک رام ہیں (ا۔ س۔ ش)

ابوالکلام آزاد

مجھے اپنی بست سالہ سیاسی زندگی میں ہر مکتبِ خیال کے رہنما کی معیت میں کچھ عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ بعضوں کو میں نے نزدیک سے دیکھا ہے اور بعض کو قریب سے سنا ہے۔ لیکن ابوالکلام آزاد سب میں آگے اور سب سے الگ ہیں۔ اُن کی بات چیت اتنی شستہ و رفتہ ہوتی ہے کہ کوثر و تسنیم کی لہریں نچھاور ہوتی ہیں اور لہجہ اتنا پیارا کہ الفاظ اس کی تاثیر بیان کرنے سے معذور ہیں۔ وہ واقعی ابوالکلام ہیں، جو کچھ بولتے اور جو کچھ لکھتے ہیں اس سے انسان کا ذہن پرسش کی طرف نہیں بلکہ پرستش کی طرف جاتا ہے۔

حالات سازگار ہوتے تو وہ جمہوریۂ ہندوستان کے پہلے صدر ہوتے لیکن اب وہ کوثر و تسنیم کی ایک ایسی لہر ہیں جو گنگ و جمن کی لہروں کے ساتھ بہہ رہی ہے۔ عربوں میں ہوتے تو ابن تیمیہؒ ہوتے، ہندوؤں میں ہوتے تو اب تک اُن کے بت پجتے ہوتے، لیکن وہ مسلمانوں میں تھے اس لیے ان کے حصے میں وہ سب کچھ نہیں آیا جس سے علمائے امت کی جبینیں لبریز ہیں۔

ابوالکلام، ابوالکلام نہ ہوتے تو تاج محل ہوتے اور اگر تاج محل انسانی پیکر میں ڈھل جائے تو وہ ہرگز ہرگز ابوالکلام نہیں ہوسکتا ہے۔

آفاقہا گردیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

آغا شورش کاشمیری